جلد ۱۰۲ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۸ء عدد ۱

مضامین

مقالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

ہندوستان کے مسلمان جن نازک حالات سے گذر رہے ہیں اس سے بھی انکو سبق حاصل نہیں ہوتا اور وہ ابتک پرانے جھگڑوں میں مبتلا ہیں، اس مرتبہ میلاد النبی کی تقریب میں شیعہ سنّی تصادم کی نوبت تو نہیں آئی لیکن لکھنؤ اور کانپور وغیرہ میں اسکا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا اور غازیپور میں تو مدح صحابہ کے جلوس پر گولی چل گئی جسمیں کئی آدمی مارے گئے، رحمۃ للعالمینؐ کی ولادت دنیا کے لیے امن و سلامتی کی نوید اور ہدایت و رہنمائی کا پیغام تھی، مگر مسلمانوں نے اس کو بھی تماشہ بنا دیا ہے، اس مبارک تقریب کو منانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ میلادؐ کی مجالس میں حیات طیبہ اور سیرت پاک کے سبق آموز واقعات آپکے اسوۂ حسنہ صحابۂ کرام کے دینی خدمات ان کے مجاہدانہ کارنامے اور دنیا پر اسلام کی برکتوں اور اس کے احسانات کو بیان کیا جائے، جس سے مسلمانوں کے ایمان میں تازگی اور جوش عمل پیدا ہو اور غیر مسلم بھی اس سے متاثر ہوں، سیرت یا مدح صحابہ کے شاندار جلسے یا جلوس نکالنا صحیح طریقہ نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ مذہبی تقریبات میں جلوس نکالنا مسلمانوں کا قانونی حق ہے جس سے انکو کوئی نہیں روک سکتا، لیکن اس قسم کے جلسے اور جلوس سراسر بدعت اور محرم کی نقل ہیں، مدح صحابہ یا صحیح اصطلاح میں اسوۂ صحابہ بیان کرنے کی اصل جگہ مجالس میلاد ہیں شارع عام نہیں، اور جن جلوسوں سے مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہوا ان میں تو اور بھی احتیاط کی ضرورت ہے، میلاد نبوی کی تقریب تو ایسی ہے کہ سب مسلمانوں کو مل کر منانا چاہیے لیکن بدقسمتی سے اسکو بھی انھوں نے اختلاف کا ذریعہ بنا دیا ہے۔

یہ مسئلہ وقتی نہیں ہے بلکہ آئندہ اس سے شیعہ سنّی اختلاف کا خطرہ ہے، اسلیے دونوں کے سنجیدہ اشخاص خصوصاً علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ ان فتنوں کو روکنے کی کوشش کریں، خدا کے یہاں ہرگز اسکی بازپرس نہیں ہوگی کہ

انھوں نے مدح صحابہ کا جلوس کیوں نہیں نکالا یا تبرا کیوں نہیں کہا، مگر اسکی ضرور بازپرس ہوگی کہ انھوں نے ملت اسلامیہ کے دو فرقوں کو بدعات پر لڑنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا، مروجہ شکل میں مدح صحابہ ہو یا تبرا کون دینی شعار ہے جس کے لیے اصرار کیا جائے، اس زمانہ میں اس قسم کے مسائل پر اختلاف اور ہنگامہ آرائی سراسر نادانی اور قومی خودکشی ہے، آج کسی اسلامی ملک میں ان مسائل کا وجود نہیں، یہ فخر صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو حاصل ہے کہ وہ اس زبوں حالی میں بھی انکو زندہ کیے ہوئے ہیں۔

گذشتہ مہینہ قومی یکجہتی کونسل کا اجلاس بڑے اہتمام سے کشمیر میں ہوا، جس میں تقریباً تمام پارٹیوں نے شرکت کی اور بڑی خوش آیند تقریریں اور مفید تجویزیں پاس ہوئیں، اس وقت حالات سے مجبور ہو کر حکومت نے اس طرف توجہ کی ہے لیکن اندیشہ ہے کہ آیندہ یہ جوش ٹھنڈا نہ پڑ جائے اور کونسل کی کوششوں کا دائرہ لسانی اور صوبائی مسائل تک محدود نہ ہو جائے، سب سے بڑا سوال عمل کا ہے، جب تک پوری جرأت کے ساتھ فتنہ پروری کی ہر راہ کو بند نہ کیا جائیگا محض تقریروں اور تجویزوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی بنا پر کاش جیسے قوم پرور نے جلسہ میں شرکت سے انکار کر دیا، تاہم سنجیدگی سے کسی برائی کا احساس بھی ایک اچھی علامت ہے، اور حسن ظن یہی رکھنا چاہیے کہ ان تجویزوں پر عمل بھی ہوگا۔ اسکی ذمہ داری بڑی حد تک صوبائی حکومتوں پر ہے، ان کی امداد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، اب فرقہ پروری کی جڑیں اتنی پھیل گئی ہیں کہ ان کو اکھاڑنا تنہا حکومت کے بس کا کام نہیں، انتظامیہ کی مستعدی سے فسادات کی شدت میں تو کمی آسکتی ہے مگر انکا پورا انسداد نہیں ہو سکتا، یہ کام ترقی پسند سیکولر پارٹیوں کا ہے کہ وہ سب مل کر فساد کے بنیادی اسباب اور تعصب و تنگ نظری کی موجودہ فضا کو صاف کریں، اس کے بغیر اتحاد و یکجہتی کا خواب پورا نہیں ہو سکتا۔

اس مہینہ میں نزہۃ الخواطر جلد ہشتم پر ایک مضمون شائع ہو رہا ہے، اس میں دائرۃ المعارف حیدرآباد کا بھی ذکر آیا ہے، اس تقریب سے ایک بات زبان قلم پر آگئی جب سے دائرہ حکومت ہند کے انتظام میں آیا ہے اسکی مطبوعات کا

حصول سخت دشوار ہو گیا ہے، پہلے وہ خاص خاص علمی اداروں کو اپنی مطبوعات ہدیۃً بھیجتا تھا، اب اس کے لیے حکومت ہند کی منظوری کی ضرورت ہے، جو اصحاب دائرہ کی کوشش کے باوجود ابتک حاصل نہیں ہو سکی، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کتابیں ہدیۃً آتی ہیں اور نہ قیمۃً بھیجنے کے لیے ادارہ تیار ہوتا ہے، ہم نے نزہۃ الخواطر کی بعض جلدیں قیمۃً منگانا چاہیں، وہاں سے جواب آیا کہ دارالمصنفین کا نام عرصہ ہوا حکومت ہند میں بھیجا جا چکا ہے، منظوری کے بعد ہدیۃً بھیجی جائیں گی، اس واقعہ کو ایک سال کے قریب ہو گیا، مگر ابھی تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اسلیے اب دائرۃ المعارف کو پرانی وضعداری چھوڑ دینی چاہیے اور اگر وہ ہدیۃً کتابیں نہیں بھیج سکتا تو قیمۃً بھیجنے میں اسکو تامل نہ ہونا چاہیے، ان کے حصول کی کوئی شکل تو پیدا ہو، یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کون کونسی نئی کتابیں شائع ہوئیں۔

ابھی حال میں حدیث کی ایک اہم کتاب سنن امام سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ مجلس علمی ڈابھیل نے شائع کی ہے، امام موصوف امام احمد بن حنبل اور امام مسلم کے شیوخ میں ہیں اور انکی سنن حدیث کی قدیم ترین کتابوں میں ہے، مسند احمد بن حنبل پر بھی اسکو تقدم حاصل ہے، کتب حدیث میں صرف موطا امام مالک اور مسند ابو داؤد طیالسی اس سے قدیم ہیں، اس لحاظ سے اسکی بڑی اہمیت ہے، مگر یہ کتاب ناپید تھی، صرف کتابوں میں اسکا نام ملتا تھا، فاضل محقق ڈاکٹر حمید اللہ کو حسن اتفاق سے قسطنطنیہ کے ایک کتب خانہ میں اسکا تیسرا حصہ مل گیا، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی نے اسکو ایڈٹ کیا ہے، ان کا نام تصحیح و تحشیہ اور ترتیب و تہذیب وغیرہ کی صحت و خوبی کی پوری ضمانت ہے، اب مجلس علمی ڈابھیل نے اسکو خوبصورت ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا ہے، کتاب کے شروع میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے قلم سے اس نسخہ کے انکشاف کی رُوداد اور اسکی کیفیت اور مصنف کا مختصر حال اور فاضل مرتب کے قلم سے اسکے رواۃ کا مختصر تذکرہ ہے، یہ جلد فرائض کے بعض ابواب، کتاب ولایۃ العصبہ، کتاب الوصایا، کتاب النکاح اور کتاب الطلاق پر مشتمل ہے، اسکی اشاعت سے حدیث کے ذخیرۂ کتب میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوا جس کیلئے فاضل مرتب اور مجلس علمی دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ قیمت درج نہیں ہے، مجلس علمی سملک ڈابھیل، ضلع سورت سے ملے گی۔

مقالات

ابن الفارض

عربی صوفیانہ شاعری کی ایک منفرد شخصیت

از جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب رضا شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

ایک سبق آموز واقعہ دوسرے صوفیہ کی طرح شیخ کی بھی بہت سی کرامتیں منقول ہیں، مگر ہم نے انکو عمداً قلم انداز کیا ہے لیکن ایک سبق آموز واقعہ نقل کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

شیخ کے صاحبزادے کمال الدین محمد سے منقول ہے کہ ایک بار شیخ سو رہے تھے کہ اسی حالت میں اچانک بلند آواز سے بار بار کہنے لگے "یا رسول اللہ! آپنے سچ فرمایا" ساتھ ہی ساتھ انگلیوں سے کچھ اشارہ بھی کرتے جاتے تھے، نیند سے بیدار ہونے کے بعد بھی یہی کہتے رہے اور اسی طرح اشارہ بھی کرتے رہے، اس وقت کمال الدین محمد موجود تھے، انھوں نے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ بیٹا! میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا، آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ اے عمر! تم اپنا نسب کس سے ملاتے ہو؟ میں نے عرض کیا آپ کی دائی حلیمہ سعدیہ کے قبیلہ بنو سعد سے مجھے انتساب ہے، آپنے فرمایا، نہیں، تم مجھ سے ہو اور تمھارا

نسب مجھ سے متصل ہے، میں نے پھر عرض کیا کہ اپنا جو نسب میں نے اپنے باپ دادا سے سنا ہے وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور وہ یہی ہے کہ میرا نسب بنو سعد تک پہنچتا ہے، اس پر آنحضرت صلعم نے اپنی آواز کو کھینچ کر پھر وہی فرمایا نہیں، تم مجھ سے ہو اور تمھارا نسب مجھ سے ملتا ہے، اس مکرر ارشاد پر بیساختہ یہ الفاظ دہرانے لگا کہ "یا رسول اللہ! آپ نے سچ فرمایا"۔[1]

غالباً اسی طرف شیخ نے اپنے ان اشعار میں بھی اشارہ فرمایا ہے ؎

ما رأت مثلك عيني حسنا	وكمثلي بك صبا لم ترى
نسب اقرب في شرع الهوى	بيننا من نسب من أبوى[2]

(تجھ جیسا کوئی حسین میری آنکھ نے نہیں دیکھا اور نہ تو نے مجھ جیسا کوئی عاشق دیکھا، ہمارا یہ نسب محبت کی شریعت میں آبائی نسب کی بہ نسبت زیادہ قریب ہے۔)

شیخ کے متعلق اس قسم کے بہت سے واقعات مشہور تھے یا کم از کم خواص کے درمیان معروف تھے، چنانچہ شیخ علی نے آپ کے سوانح حیات کے بیان کو اس جملہ پر ختم کیا ہے:۔

هذا ما انتهى اليه الكلام من	اب یہاں اس بیان کا سلسلہ ختم ہوگیا
هذه الترجمة وسكت عن ذكر	اور میں نے نکتہ چینی اور بداعتقادی
احوال خارقة مبهمة خوفا	کے خوف سے خوارق کے ذکر سے
من ردي الانتقاد أو سيئ الاعتقا[3]	سکوت اختیار کیا ہے،

عصری معاشرہ یہ امر مسلّم ہے کہ انسان بڑی حد تک اپنے ماحول اور معاشرہ کا پروردہ ہوتا ہے، عام سماجی حالات، کی پرچھائیاں اس کی زندگی کے خد و خال پر نمایاں طور پر منعکس ہوتی ہیں، اس لیے اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے زمانہ کی ایک ہلکی جھلک پیش کر دیجائے۔

۱؎ ملاحظہ ہو مقدمہ شرح دیوان ص ۷ ۲؎ دیوان ابن الفارض ص ۱۳ ۳؎ مقدمہ شرح دیوان ص ۱۳

یہ حقیقت ہے کہ شیخ کی پوری زندگی ایوبی حکومت[1] کے زیر سایہ گذری ہے، مصر میں ایوبی اقتدار کی بنیادیں شیخ کی ولادت سے قبل ہی مستحکم ہو چکی تھیں، جیسے جیسے شیخ زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے شباب کو پہنچ رہے تھے، ایوبی سیادت بھی بتدریج بام عروج پر چڑھتی جارہی تھی تاآنکہ مصر، شام اور حجاز پوری طرح ایوبی سلاطین کے زیر اثر آگئے، شیخ جبکہ مکہ معظمہ سے مصر واپس آئے تو اس وقت ان کی عمر چالیس[2] سے متجاوز ہو چکی تھی اور سلطان الملک الکامل تخت سلطنت پر متمکن تھا جس نے ۶۱۶ھ سے ۶۳۵ھ تک فرمانروائی کی ہے،

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ایک عرصہ کی شورش، بدامنی، صلیبی جنگوں اور باہمی خونریزیوں کے بعد اہل مصر کو کچھ سکون اور امن وامان حاصل ہوا تھا، فتنہ و فساد اور تباہی وبربادی کے زمانہ میں قدرتی طور پر طبائع کا میلان قضا و قدر، رضا و تسلیم، زہد و تقوی، دینداری اور روحانیت کی طرف ہو جاتا ہے، صلاح الدین ایوبی[3] کے ہاتھوں بیت المقدس کی فتح سے سارے عالم اسلامی میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے، مسلمانوں کے قلوب شکر و امتنان کے جذبات سے لبریز اور وہ بیساختہ مالک حقیقی کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے، مصر میں ہر طرف دینی زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی اور مصری معاشرہ کے رگ وپے میں دینی روح جاری وساری ہوگئی، مساجد و معابد میں جان آگئی، نئے نئے دینی مدارس کھولے گئے، اور علماء و صوفیہ کیلئے علمی مراکز اور خانقاہیں تعمیر کی گئیں۔

سب سے پہلے سلطان صلاح الدین ایوبی نے ہی اس طرف توجہ کی، اس نے شوافع، احناف اور مالکیوں کے لیے الگ الگ متعدد مدارس قائم کیے، جہاں قرآن وحدیث اور تفسیر و فقہ کی تعلیم بڑے شد و مد کے ساتھ جاری ہوگئی، اسی نے سب سے پہلے مصر میں

۱؎ ایوبی حکومت کے لیے دیکھیے حسن المحاضرہ، ج ۲ ص ۲۳ و مابعد ۲؎ ۳؎ صلاح الدین ایوبی کے حالات کے لیے دیکھیے، مرآۃ الزمان لابن الجوزی، ج ۸ ص ۲ و مابعد اور وفیات الاعیان، ج ۶ ص ۱۳۹ و مابعد

خانقاہی نظام کی بنیاد ڈالی، چنانچہ ۵۶۹ھ میں اُس نے دار سعید السعداء کو صوفیہ کیلئے مخصوص کر کے ایک شیخ مرشد کو اس کا متولی بنایا اور اس کے لیے بہت سی جاگیریں وقف کیں، تاکہ جو فقراء و صوفیہ باہر سے مصر آئیں وہ اس میں قیام کریں، ان کے لیے روزینہ اور ان کے کھانے پینے اور دیگر ضروریات زندگی کا معقول انتظام بھی کر دیا، غرض مصر میں اس قسم کی پہلی خانقاہ یہی تھی جو صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں وجود میں آئی، اور بعد میں دویرۃ الصوفیہ کے نام سے مشہور ہوئی[۱]۔

اس کے بعد بڑی سرعت کے ساتھ مصر میں خانقاہیں، رباط، زوایا اور تکایا قائم ہونے لگے جن کے لیے امراء و حکام کے درمیان مسابقت شروع ہوگئی، وہ خانقاہیں تعمیر کراتے اور بڑی بڑی جائدادیں ان کے لیے وقف کرتے، ہر خانقاہ میں ایک شیخ ہوتا تھا، اسی کی نگرانی میں اس کے مریدین و معتقدین اور دیگر فقراء و صوفیہ رہتے تھے، اس کے علاوہ ایک محافظ بھی مقرر ہوتا تھا، اس طرح خانقاہ کے سارے امور بڑے نظم و ضبط اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام پاتے تھے[۲]۔

عوام کے دلوں میں بھی علماء و مشائخ اور فقراء و صوفیہ کے لیے بڑی عزت تھی، وہ ان کی بیحد تعظیم و تکریم کرتے تھے، اور اکثر دعا و برکت کے حصول کے لیے خانقاہوں میں حاضر ہوتے تھے، صوفیہ کی متعدد جماعتیں تھیں، اور ہر جماعت کے کچھ مخصوص شعائر و امتیازات تھے، ہر جماعت کا امام ان کا شیخ ہوتا تھا، جب شیخ باہر نکلتا تھا تو اس کی پوری جماعت اسکے پیچھے ایک جلوس کی شکل میں ہوتی تھی، اور وہ سب اپنی مخصوص ہیئت کے ساتھ مخصوص لباس

[۱] دیکھئے: صبح الاعشیٰ، ج ۳ ص ۳۶۴، ۳۶۵ اور حسن المحاضرہ، ج ۲ ص ۱۸۷

[۲] خوانق، زوایا اور تکایا کیلئے دیکھئے: خطط علی باشا مبارک، ج ۶ ص ۱۶-۵۷

زیب تن کیے ہوئے تھے، چنانچہ جمعہ کے دن اسی شان کے ساتھ صوفیہ کی تمام جماعتیں مختلف راستوں سے جامع مسجد جایا کرتی تھیں، یہ منظر اس قدر شاندار، دلکش اور جاذبِ نظر ہوتا تھا کہ جمعہ کے دن لوگ دور دور سے محض اسی لیے قاہرہ آتے تھے کہ اس روح پرور نظارہ سے قلب و نظر کے لیے خیر و برکت اور تازگی و فرحت کا سامان مہیا کریں۔

معاشرہ کی اس تصویر کو سامنے رکھنے کے بعد ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس دینی و روحانی ماحول میں شیخ ابن الفارض کا کیا مقام تھا، وہ صوفیہ کے کس گروہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا طریقِ تصوف کیا تھا، ان کی خانقاہ کہاں تھی اور انکے مریدین و معتقدین کا کیا حال تھا، لیکن افسوس ہے کہ ان سوالوں کے جوابات تشفی بخش طور پر کہیں نہیں ملتے، بلکہ بعض سوال کا تو کوئی جواب ہی نہیں ملتا، یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ معاصر صوفیہ مشائخ میں سے کن لوگوں کے ساتھ ابن الفارض کی راہ و رسم تھی، البتہ شیخ سہروردیؒ سے انکی ایک ملاقات[۱] کا پتہ چلتا ہے، جس کی تفصیل و تجزیہ سے کسی حد تک کچھ باتوں کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

شیخ سہروردی کی ملاقات

شیخ کے صاحبزادے کمال الدین محمد بیان کرتے ہیں کہ شیخ سہروردیؒ نے جب ۶۲۸ھ میں آخری حج کیا تو آپکے ہمراہ اہل عراق کی ایک بڑی جماعت تھی، آپ نے طوافِ کعبہ اور وقوفِ عرفات کے وقت اپنے گرد مریدین و معتقدین کا ایک زبردست ہجوم دیکھا، جس سے بیحد متاثر ہوئے اور دل بھر آیا، اسی اثنا میں ان کو خبر ملی کہ شیخ ابن الفارض بھی حرم شریف کے اندر موجود ہیں تو سہروردی کو ان کی زیارت کا اشتیاق ہوا، اور وہ بیساختہ رونے لگے اور اسی عالم کیف میں خود کو مخاطب

[۱] ملاحظہ ہو مقدمہ شرح دیوان ص ۱۰-۱۱ اور مرآۃ الجنان ج ۴ ص ۷۷-۷۸

کر کے سوال کیا کہ کیا اللہ کے نزدیک بھی تو ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ لوگ تیرے متعلق گمان کرتے ہیں اور کیا دیار حبیب میں آج تیرا بھی ذکر ہوتا ہے؟ اتفاق سے اسی وقت شیخ ابن الفارض نظر آگئے اور انھوں نے سہروردی کو اپنا یہ شعر سنایا:

لك البشارة فاخلع ما عليك فقد ذكرت ثم على ما فيك من عوج[1]

(تیرے لیے بشارت ہے پس جو لباس تیرے اوپر ہے اسے اتار دے کیونکہ جو کجی تیرے اندر ہے اس کے باوجود تیرا ذکر وہاں ہوا ہے)

شیخ سہروردی پر شعر سنکر اتنا اثر ہوا کہ وہ چیخ اٹھے اور اپنا لباس فوراً اتار دیا، دیگر مشائخ و حاضرین نے بھی ایسا ہی کیا اور سب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، جب کچھ سکون ہوا تو انھوں نے شیخ ابن الفارض کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے، فرمایا کہ یہ اس شخص کی اطلاع ہے جس کو حضوری حاصل ہے، اس کے کچھ دنوں کے بعد پھر دونوں صاحبدل بزرگوں کی ملاقات ہوئی، ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی، لیکن اس گفتگو کی تفصیل نہیں ملتی۔

کمال الدین محمد کہتے ہیں کہ اسی مجلس میں شیخ سہروردی نے میرے والد شیخ ابن الفارض سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے اور میرے بھائی عبدالرحمن کو اپنے طریقہ کے مطابق خرقہ صوفیہ پہنادیں، لیکن انھوں نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے، مگر شیخ سہروردی برابر اصرار کرتے رہے، تاآنکہ ابن الفارض نے ان کو اجازت دیدی اور شیخ سہروردی نے دونوں صاحبزادوں کو خرقہ پہنایا، اسی مجلس میں انھوں نے شہاب الدین بن الخیمی اور انکے بھائی شمس الدین کو خرقہ عطا فرمایا، کیونکہ ان دونوں کو شیخ ابن الفارض اپنی اولاد کی طرح

[1] دیوان ابن الفارض، ص ۸۴

عزیز رکھتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے بھی شیخ سہروردی کے ہاتھوں خرقۂ صوفیہ پہنا، اس مجلس میں مشائخِ عظام کی ایک بڑی جماعت بھی موجود تھی،

مذکورہ واقعہ کے تجزیہ سے مندرجہ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:۔

۱۔ شیخ سہروردی اور شیخ ابن الفارض کے درمیان جس انداز سے گفتگو ہوئی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی پہلی ملاقات نہ تھی بلکہ اس سے قبل بھی دونوں کی ملاقاتیں ہو چکی تھیں یا کم از کم وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف اور حالات سے پوری طرح باخبر تھے،

۲۔ ابن الفارض ایک صاحب حال بزرگ تھے، اور ان کی کیفیت میں اس قدر شدت اور قوت تھی کہ جس مجمع میں پہنچ جاتے تھے، سارا مجمع ان کی کیفیت سے متاثر ہو جاتا تھا، اور ان کی حالت کچھ اس قسم کی تھی جیسا کہ شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

درمحفلِ خود جائے مدہ ہیچ منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

۳۔ حجاز سے مصر واپس آنے کے بعد شیخ ابن الفارض کم از کم ایک بار اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ گئے تھے، یوں تو سرزمین حجاز کے ذرہ ذرہ سے ان کو ایسا قلبی تعلق تھا کہ اگر وہ ہر سال حج کے لیے جاتے رہے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے لیکن اس کے علاوہ ان کے اور کسی سفرِ حج کا پتہ نہیں چلتا، مگر ان کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفرِ حج کے لیے بیقرار رہتے رہے ہوں گے اور کوئی بڑا مانع ہی ان کو اس سے باز رکھتا ہوگا، کیونکہ ان کی شاعری تمامتر اسی دیار کی یاد اور محبت سے معمور ہے، کوئی قصیدہ ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر نہ ملتا ہو، ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

کرکے سوال کیا کہ کیا اللہ کے نزدیک بھی تو ایسا ہی ہے جیسا کہ یہ لوگ تیرے متعلق گمان کرتے ہیں، اور کیا دیارِ حبیب میں آج تیرا بھی ذکر ہوتا ہے؟ اتفاق سے اسی وقت شیخ ابن الفارض نظر آگئے، اور انھوں نے سہروردی کو اپنا یہ شعر سنایا:

لك البشارة فاخلع ما عليك فقد ذكرت ثم على ما فيك من عوج[۱]

(تیرے لیے بشارت ہے پس جو لباس تیرے اوپر ہے اسے اتار دے کیونکہ جو کجی تیرے اندر ہے اس کے باوجود تیرا ذکر وہاں ہوا ہے)

شیخ سہروردی پر شعر سنکر اتنا اثر ہوا کہ وہ چیخ اٹھے اور اپنا لباس فوراً اتار دیا، دیگر مشائخ و حاضرین نے بھی ایسا ہی کیا اور سب پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی، جب کچھ سکون ہوا تو انھوں نے شیخ ابن الفارض کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے، فرمایا کہ یہ اس شخص کی اطلاع ہے جس کو حضوری حاصل ہے، اس کے کچھ دنوں کے بعد پھر دونوں صاحبدل بزرگوں کی ملاقات ہوئی، ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور کچھ دیر گفتگو ہوتی رہی، لیکن اس گفتگو کی تفصیل نہیں ملتی۔

کمال الدین محمد کہتے ہیں کہ اسی مجلس میں شیخ سہروردی نے میرے والد شیخ ابن الفارض سے اجازت طلب کی کہ وہ مجھے اور میرے بھائی عبدالرحمن کو اپنے طریقہ کے مطابق خرقۂ صوفیہ پہنادیں، لیکن انھوں نے اجازت نہ دی اور فرمایا کہ یہ ہمارا طریقہ نہیں ہے، مگر شیخ سہروردی برابر اصرار کرتے رہے، تاآنکہ ابن الفارض نے ان کو اجازت دیدی اور شیخ سہروردی نے دونوں صاحبزادوں کو خرقہ پہنایا، اسی مجلس میں انھوں نے شہاب الدین بن الخیمی اور انکے بھائی شمس الدین کو خرقہ عطا فرمایا، کیونکہ ان دونوں کو شیخ ابن الفارض اپنی اولاد کی طرح

[۱] دیوان ابن الفارض، ص ۸۴

عزیز رکھتے تھے، ان کے علاوہ اور بہت سے لوگوں نے بھی شیخ سہروردی کے ہاتھوں خرقۂ صوفیہ پہنا، اس مجلس میں مشائخِ عظام کی ایک بڑی جماعت بھی موجود تھی،

مذکورہ واقعہ کے تجزیہ سے مندرجۂ ذیل باتیں واضح ہوتی ہیں:-

۱- شیخ سہروردی اور شیخ ابن الفارض کے درمیان جس انداز سے گفتگو ہوئی اُس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی پہلی ملاقات نہ تھی بلکہ اس سے قبل بھی دونوں کی ملاقاتیں ہوچکی تھیں یا کم از کم وہ ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف اور حالات سے پوری طرح باخبر تھے،

۲- ابن الفارض ایک صاحب حال بزرگ تھے، اور ان کی کیفیت میں اس قدر شدت اور قوت تھی کہ جس مجمع میں پہنچ جاتے تھے، سارا مجمع ان کی کیفیت سے متاثر ہوجاتا تھا، اور ان کی حالت کچھ اس قسم کی تھی جیسا کہ شاعر نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

در محفلِ خود جائے مدہ ہیچ منے را افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

۳- حجاز سے مصر واپس آنے کے بعد شیخ ابن الفارض کم از کم ایک بار اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ گئے تھے، یوں تو سرزمین حجاز کے ذرہ ذرہ سے ان کو ایسا قلبی تعلق تھا کہ اگر وہ ہر سال حج کے لیے جاتے رہے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، لیکن اس کے علاوہ ان کے اور کسی سفر حج کا پتہ نہیں چلتا، مگر ان کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سفر حج کے لیے بیقرار رہتے رہے ہوں گے اور کوئی بڑا مانع ہی ان کو اس سے باز رکھتا ہوگا، کیونکہ ان کی شاعری تمامتر اسی دیار کی یاد اور محبت سے معمور ہے، کوئی قصیدہ ایسا نہیں ہے جس میں کسی نہ کسی عنوان سے اس کا ذکر نہ ملتا ہو، ایک قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:-

واذا اذی ألم ألم بمهجتی   فشذا اعشاب الحجاز دوائی

أأذاد عن عذب الورود بأرضه   وأُحاد عنه وفی ثقاه بقائی

وربوعه اربی أجل وربیعه   طربی وصارف أزمة اللأواء

وجباله لی مربع ورماله   لی مرتع وظلاله افیائی

وترابه ندّی الذکی وماؤه   وردی الروی وفی ثراه ثرائی

وشعابه لی جنة وقبابه   لی جُنّة وعلی صفاه صفائی[۵]

(جب کسی غم سے میری روح کو کچھ اذیت پہنچتی ہے تو حجاز کی ننھی ننھی گھاسوں کی خوشبو ہی میرے لیے دوا ثابت ہوتی ہے۔ کیا سرزمین حجاز کے شیریں چشموں سے مجھے دور کر دیا جائےگا اور میں وہاں پہنچنے سے روک دیا جاؤں گا حالانکہ اسی کے ذروں سے میری بقا وابستہ ہے۔ اسی کے دیار میرا مقصود ہیں اور وہاں اسی کی بہار میری نشاط ہے اور وہی میرے شدت غم کو دور کرنے والی ہے۔ اسی کے پہاڑ میری قیامگاہ، اسی کے ریتیلے میدان میری چراگاہ اور اسی کے سائے میری پناہ گاہ ہیں۔ میرے لیے اس کی خاک میں معطر خوشبو، اسکے پانی میں سیرابی اور اس کی مٹی میں دولت ہے۔ اسی کی وادیاں میرے لیے جنت اور اسی کے قبے میرے لیے ڈھال ہیں اور اسی کے کوہ صفا پر میرے لیے صفائے باطنی ہے)۔

۴۔ شیخ ابن الفارض کے یہاں روایتی اور رسمی بیعت و خلافت وغیرہ کا کوئی قاعدہ نہیں تھا، سلوک و معرفت کا ان کا اپنا ایک مخصوص مسلک تھا اور وہ ان کی ایک ذاتی حالت اور انفرادی کیفیت تھی، اسی طرح آپ کے یہاں روحانی تعلیم و تربیت کا بھی کوئی مخصوص رسمی طریقہ نہیں تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بقول مرزا غالب وہ ہر قسم کے رسمی

۵؎ دیوان ابن الفارض، ص ۶۹ ۔ ۷۰

تکلفات سے بالاتر تھے:

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

۵۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ معاصر صوفیہ میں شیخ کا مقام بہت بلند تھا، کیونکہ شیخ سہروردیؒ اپنے عہد کے نہایت مشہور و مقبول درویش تھے، اور ان کے مریدین کی تعداد بیشمار تھی، اس وقت وہ اپنی عمر کے آخری مراحل سے گذر رہے تھے، انھوں نے ایک مجمع عام میں جس کے اندر عوام و خواص سب موجود تھے جس طرح ابن الفارض کی عزت کی تو دوسروں کی نظر میں شیخ ابن الفارض کا کیا درجہ رہا ہوگا، اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے، شیخ کو خود بھی اپنے مقام کا احساس تھا، چنانچہ بعض مواقع پر جوش و انبساط کے عالم میں اس کا اظہار بھی کیا ہے، ایک موقع پر فرماتے ہیں:-

نسخت بحبی آیة العشق من قبلی   فاهل الهوی جندی وحکمی علی الکل

وکل فتی یهوی فانی امامه   وانی بریء من فتی سامع العذل

ولی فی الهوی علم تجل صفاته   ومن لم یفقهه الهوی فی جهل[۵]

(میں نے اپنی محبت کے ذریعہ عشق کی اگلی آیت کو منسوخ کر دیا۔ پس تمام اہل محبت میرے سپاہی ہیں اور ان سب پر میری حکومت ہے۔ جو انسان بھی جمال حقیقی کا دلدادہ ہے میں اس کا امام ہوں اور محبت کے معاملہ میں ملامت سننے والے انسان سے میں بری ہوں۔ محبت کے میدان میں مجھے ایسا علم حاصل ہے جس کے صفات جلیل الشان ہیں، اور جس کو محبت علم و فہم نہ عطا کرے وہ جہل میں مبتلا ہے۔)

شیخ جعبری کی ملاقات | اس عہد کے ایک دوسرے بزرگ شیخ برہان الدین جعبریؒ کے

۵؎ دیوان ابن الفارض، ص ۹۷

متعلق بھی ایک روایت ملتی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھی ایک ملاقات شیخ ابن الفارض سے ہوئی تھی، اگرچہ یہ ملاقات شیخ کی زندگی کے آخری لمحات میں ایک مختصر مدت کے لیے ہوئی، مگر اس سے بھی شیخ کے احوال و ملاقات کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے، اس ملاقات کی تفصیل یہ ہے:-[1]

یہ روایت بھی شیخ کے صاحبزادے کمال الدین محمد ہی سے منقول ہے کہ ایک دن شام ہی سے ان کی طبیعت کچھ پژمردہ ہوگئی اور رات بھر وہی کیفیت رہی اس لیے نماز فجر کے بعد وہ اپنے والد شیخ ابن الفارض کی قبر کی زیارت کے ارادہ سے نکلے، جب شیخ برہان الدین جعبری کی مسجد کے پاس سے گذرے تو تقریر کی آواز سنائی دی، اس کو سنکر وہ مسجد کے اندر داخل ہوگئے، وہاں دیکھا کہ شیخ جعبری ان کے والد شیخ ابن الفارض کے اس شعر پر تقریر فرما رہے ہیں:

فلم تھوَنی مالم تکن فیّ فانیا ولم تفنَ مالم تجتلی فیک صورتی[2]

(تو میرا عاشق نہیں ہو سکتا تاآنکہ میرے اندر تو فنا نہ ہو جائے اور تو فنا نہیں ہو سکتا تاآنکہ تیرے اندر میری صورت جلوہ گر نہ ہو جائے۔)

کمال الدین محمد کو دیکھکر شیخ جعبری نے بڑی حیرت و مسرت کا اظہار کیا، اور فرمایا کہ میں جس ہستی کے کلام پر گفتگو کر رہا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کے صاحبزادے کو میرے پاس بھیجدیا، پھر انھوں نے کمال الدین کے سر پر دست شفقت پھیرا جس سے ان کی انقباضی کیفیت دور ہوگئی اور کچھ دیر تک بڑی فرحت و نشاط کے ساتھ وہ شیخ جعبری کی تقریر سنتے رہے۔ اس میں انھوں نے اس شعر کے متعلق عجیب و غریب نکات بیان کئے

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمہ شرح دیوان، ص ۱۱-۱۳ اور نفحات الانس: ص ۵۴۳-۵۴۵

[2] دیوان ابن الفارض ص ۴۳

بعد میں کمال الدین محمد کو معلوم ہوا کہ اس شعر کے ذیل میں شیخ جعبری نے خود اپنا واقعہ اس طرح بیان کیا تھا کہ جس زمانہ میں وہ سیاحت کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کی روح عشق الٰہی کے نشہ میں سرشار تھی، ایک دن ناگاہ ایک شخص بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے پاس سے مذکورہ بالا شعر پڑھتے ہوئے گذرا، اس کو سنتے ہی شیخ جعبری کو محسوس ہوا کہ یہ صرف کسی عاشق صادق ہی کا جذبہ ہو سکتا ہے، اس لیے وہ تیزی سے اس شخص کی طرف لپکے اور اس سے پوچھا کہ یہ روح پرور شعر تجھے کہاں سے ملا، اس نے جواب دیا کہ شیخ ابن الفارض کا شعر ہے، اس نے یہ بھی بتلایا کہ اس وقت شیخ مصر میں ہیں، اور ان کی وفات کا وقت قریب ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضری دوں، اس لیے وہیں جا رہا ہوں، یہ کہکر وہ روانہ ہوگیا، شیخ جعبری بھی اس کے ساتھ چل پڑے۔

جب ابن الفارض کی خدمت میں شیخ جعبری پہنچے تو دیکھا کہ وہ جاں بلب ہیں، جعبری نے سلام عرض کیا، شیخ نے سلام کا جواب دینے کے بعد بیٹھنے کا اشارہ کیا اور یہ بشارت دی کہ شیخ جعبری اولیاء اللہ میں سے ہیں، شیخ جعبری نے اپنے اطمینان قلب کے لیے اس کی دلیل طلب کی، فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ میری وفات کے وقت اولیاء اللہ کی ایک جماعت موجود ہو، اور اللہ نے سب سے پہلے تم کو میرے پاس بھیجا، پھر شیخ جعبری نے معرفت الٰہی سے متعلق ایک بڑا نازک سوال کیا، جس کی خلش عرصہ سے ان کے دل میں تھی اور جسے متعدد مشائخ سے وہ دریافت کر چکے تھے، لیکن کسی نے اس کا جواب نہیں دیا تھا، وہ سوال یہ تھا کہ کسی کا علم ذات باری کا احاطہ کر سکتا ہے؟ اس سوال پر شیخ ابن الفارض نے بڑے استعجاب کے ساتھ انکی طرف دیکھا اور فرمایا "ہاں، اگر اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے، تو اولیاء اللہ ہی اس کو محیط ہوتے ہیں اور تم بھی ان ہی میں سے ہو۔"

اس کے بعد شیخ جعبری کہتے ہیں کہ مجھے ایسا نظر آیا جیسے جنت شیخ کے سامنے مجسم ہوکر آگئی ہے، شیخ نے اسے دیکھ کر ایک آہ کھینچی اور چیخ اٹھے، چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا اور زار وقطار رونے لگے، پھر فرمایا:۔

ان کان منزلتی فی الحب عندکم — ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

أمنیة ظفرت روحی بھا زمنا — والیوم احسبھا اضغاث احلامی[1]

(اگر محبت میں میرا مقام تمھارے نزدیک یہی تھا جسے میں اس وقت دیکھ رہا ہوں تو میں نے اپنی عمر ضائع کردی۔ وہ ایک آرزو تھی جس سے میری روح کچھ عرصہ شادکام رہی اور آج میں اسے خواب پریشاں خیال کررہا ہوں۔)

یہ سنکر شیخ جعبری نے عرض کیا "حضرت! یہ تو ایک معزز مقام ہے"۔ شیخ نے فرمایا کہ رابعہ عدویہ جو ایک عورت ہیں وہ کہتی ہیں "تیری عزت کی قسم! میں نے تیری عبادت نہ جہنم کے خوف سے کی ہے اور نہ جنت کے شوق سے، بلکہ تیری ذات کریم کے عزو شرف اور تیری محبت کی وجہ سے کی ہے۔" پھر فرمایا کہ یہ وہ مقام نہیں ہے جس کو میں زندگی بھر طلب کرتا رہا اور جس کے لیے میں نے اپنی ساری عمر سلوک کے راستہ میں گذاری، تھوڑی دیر کے بعد شیخ کو کچھ سکون ہوا تو تبسم فرمایا، اور شیخ جعبری کو سلام کرکے الوداع کہا، کچھ مختصر وصیتیں بھی کیں اور مناجات میں مشغول ہوگئے، پھر یہ شعر پڑھا:۔

أروم وقد طال المدی منک نظرۃً — وکم من دماء دون مرمای طلّت[2]

(میں تجھ سے ایک نظر کا طالب ہوں اور حال یہ ہے کہ مدت طویل ہوگئی ہے اور کتنے انسانوں کا خون اس عظیم مقصد کے راستہ میں بہایا جاچکا ہے۔)

۱؎ دیوان ابن الفارض، ص ۱۱۰-۱۱۱ ۲؎ ایضاً ص ۲۲

اس درمیان میں مشائخ و اولیاء کی ایک بڑی تعداد پہنچ گئی تھی جن میں سے بعض کو شیخ جعبری پہچانتے تھے، اور بعض سے متعارف نہ تھے، کچھ ہی دیر کے بعد شیخ کے چہرہ پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے، لبوں پر مسکراہٹ ظاہر ہوئی اور روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، شیخ جعبری کہتے ہیں کہ ان آثار سے میں نے سمجھ لیا کہ شیخ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے،

اسی روایت میں شیخ جعبری نے غسل، تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ وغیرہ کا مختصر حال بیان کیا ہے، اور اسی کے ذیل میں اپنے روحانی مشاہدات و مکاشفات کا بھی ذکر کیا ہے، کہ میں نے ایسے احوال کا مشاہدہ کیا کہ تم لوگ ان کے متحمل نہیں ہوسکتے، اور اپنی اس محرومی پر افسوس کیا ہے کہ ان کو شیخ سے مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا، شیخ کی وفات کے تین دن بعد شیخ جعبری واپس ہوگئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ مصر آئے تھے، کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ مصر آئے اور مستقل طور پر یہیں اقامت گزیں ہوگئے۔

شیخ برہان الدین جعبری کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے، ان کو شیخ ابن الفارض سے جو عقیدت تھی اس کا اندازہ مذکورہ بالا روایت سے بخوبی ہوتا ہے، ایک دوسری روایت[1] سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیخ کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً ان کی قبر کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، اور اس کے گرد وغبار کو خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے تھے،

اخلاق و عادات

شیخ ابن الفارض کی زندگی اور ان کے اخلاق و عادات کے متعلق اب تک جو روایتیں نقل کی گئی ہیں، وہ تمام تر ان کے اعزہ و اقربا اور معتقدین ہی سے منقول ہیں، اس لیے ان میں عقیدت و غلو کا شائبہ ہوسکتا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ گھر کا حال گھر والا ہی بہتر جان سکتا ہے، یہ صحیح ہے کہ شیخ سے اختلاف رکھنے والے اور

۱؎ دیکھئے مقدمہ شرح دیوان، ص ۱۳)

ان پر اعتراض کرنے والے بھی خاصی تعداد میں ہوئے ہیں، لیکن ان سے شیخ کی زندگی کے عام حالات اور ان کے اخلاق وعادات کے متعلق کوئی خاص واقعہ مروی نہیں ہے، مخالفین و معترضین کے جو بیانات ملتے ہیں، ان کا تعلق زیادہ تر شیخ کے صوفیانہ افکار اور بالخصوص عقیدۂ حلول واتحاد سے ہے، جس کی تشریح آئندہ اس موقع پر آئے گی، جہاں شیخ کے صوفیانہ خیالات پر ان کی شاعری کی روشنی میں بحث کی جائے گی، مگر ان کے مخالفین بھی ان کے اخلاق اور سیرت وکردار پر کوئی اعتراض نہیں کرسکے۔

عقیدت اور عداوت کے جذبات سے قطع نظر یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک ہی واقعہ اور ایک ہی حال مختلف طبائع پر مختلف طریقے سے اثر انداز ہوتا ہے اور ہر بیان میں کسی نہ کسی حد تک بیان کرنے والے کے ذاتی تاثرات بھی لازمی طور پر شامل ہو جاتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کا مذاق کسی بیان کو صحیح تسلیم کرے لیکن دوسرا اس کو مشتبہ سمجھے۔

غرض مذکورہ روایات پر پوری احتیاط کے ساتھ نظر ڈالنے کے بعد شیخ کی شخصیت کی جو تصویر سامنے آتی ہے اس میں مندرجۂ ذیل نقوش واضح نظر آتے ہیں، اس لیے ان کی صحت پر پوری طرح یقین کیا جاسکتا ہے:۔

۱۔ اول یہ کہ شیخ کا رجحان فطری طور پر خلوت وعزلت اور ریاضت وعبادت کی طرف تھا، اس میں ان کے والد کی صحبت وتربیت کا بھی دخل ہوسکتا ہے، اور کچھ عصری حالات کا بھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس شدت کے ساتھ یہ رجحان شیخ میں پایا جاتا تھا، اس کے لیے محض صحبت وتربیت اور ماحول ہی کا اثر کافی نہیں ہے، بلکہ خود انسان کے اندر ایک فطری جوہر کی ضرورت ہوتی ہے، جو اس کو صحبت وتربیت اور ماحول کے اثر سے بلند کرکے کشاں کشاں منزل مقصود کی طرف لیجاتا ہے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

شیخ کے اندر یہ رجحان بچپن ہی سے بہت زیادہ تھا، جو آخر دم تک قائم رہا، خلوت ریاضت ہی میں ان کو لذت حاصل ہوتی تھی اور اسی سے ان کو سکون وقرار نصیب ہوتا تھا،

ابتدا میں شیخ اکثر کوہ مقطم پر چلے جاتے تھے اور تنہائی میں وقت گذارتے تھے، قیام مکہ کے دوران میں وہاں کی وادیوں اور پہاڑیوں کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے، مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد عمر کا جو حصہ قاہرہ میں گذرا اس میں بھی یہ چیز نمایاں ہے، چنانچہ وہ اکثر چلہ کیا کرتے تھے، اور چالیس چالیس دن تک مسلسل روزہ رکھتے اور راتوں میں عبادت کرتے۔ ایک موقعہ پر خود فرماتے ہیں:۔

فی ھواکم رمضان عمرہ   ینقضی ما بین احیاء وطی[1]

(تمھاری محبت میں اس عاشق کی زندگی رمضان کے مہینے کے مانند ہے جو شب بیداری اور بھوک کی حالت میں گذر رہی ہے)

۲۔ شیخ کی طبیعت میں حد درجہ تاثر اور انفعال تھا، اور یہ چیز بھی ان میں فطری معلوم ہوتی ہے، جس میں مجاہدہ وریاضت اور ذکر وفکر کی کثرت سے شدت آگئی تھی، وہ جمال سے بیحد متاثر ہوتے تھے، خواہ وہ کسی چیز میں ہو اور کسی نوعیت کا ہو، یعنی وہ جمال مطلق کے دلدادہ تھے، چنانچہ بعض روایتوں[2] سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک موقع پر کسی اونٹ کے حسن وجمال سے مسحور ہوگئے تھے، اسی طرح ایک دوسرے موقع پر ایک عطار کی دوکان میں مٹی کے ایک برتن کی خوبصورتی دیکھ کر بے قابو ہوگئے تھے، مناظر فطرت کا جمال بھی ان کے لیے بڑی

۱؎ دیوان ابن الفارض، ص ۸ ۲؎ شذرات الذہب ج ۵ ص ۱۵۱

کشش رکھتا تھا، چنانچہ وہ اکثر نیل کے کنارے مسجد مشتہی میں چلہ کشی کیا کرتے اور وہاں سے نیل کے منظر کو گھنٹوں دیکھتے رہتے تھے، اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے:

وطنی مصر وفیھا وطری ولعینی مشتھاھا مشتھاھا[1]

(میرا وطن مصر ہے اور اسی میں میری حاجت روائی ہے اور مصر کی مسجد مشتہیٰ درحقیقت میری آنکھوں کی مشتہیٰ[2] ہے۔)

۴- اس زہد و تقویٰ اور تاثر و انفعال کے باوجود شیخ نہایت خوش مزاج، نرم طبع بردبار، خاکسار اور پاک خصلت انسان تھے، شرافت و مروت اور ہمدردی و محبت کے اعلیٰ اوصاف ان کی ذات میں جمع تھے، مال و دولت کی حرص و طمع سے ان کی ذات بالاتر تھی، چنانچہ محض مخلصین ہی سے ہدایا و تحائف قبول کرتے تھے، اور وہ خود بھی مختلف طریقوں سے لوگوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے، نہایت صاف گو، راستباز اور دیانتدار تھے، وعدہ کی پابندی کرتے تھے، اور اپنی بات کا بڑا لحاظ رکھتے تھے، اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے[3]۔

ایک بار شیخ جامع مصر جانا چاہتے تھے، ان کے ہمراہ اس واقعہ کے راوی کے دادا بھی تھے، شیخ جامع ازہر سے باب زویلہ پر آئے اور وہاں ایک مکاری[4] سے سواری طے کرنا چاہی اس نے باوجود اصرار کے کرایہ طے نہیں کیا اور کہا کہ آپ لوگ فتوح[5] پر سوار ہو جایئے، شیخ فتوح ہی پر معاملہ طے کر لیا، اور سواری پر بیٹھ گئے، راستہ میں امیر فخر الدین عثمان کابلی سے ملاقات ہو گئی، وہ اور اس کے مصاحبین فوراً سواری سے اتر پڑے، امیر نے شیخ کو سلام کیا اور قریب آکر ہاتھوں کو بوسہ دینا چاہا، شیخ نے ہاتھ کھینچ لیا اور امیر کے

[1] دیوان ابن الفارض، ص ۱۰۰ [2] مشتہی: مرغوب اور پسندیدہ [3] دیکھئے مقدمہ شرح دیوان، ص ۱۰، اور بدائع الزہور ج ۱ ص ۸۲ [4] مکاری: جانور (سواری یا باربرداری کے لیے کرایہ پر دینے والا [5] فتوح جمع فتح: نذرانہ، عطیہ اور مدد جو غیر متوقع طور پر حاصل ہو جائے۔

سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی، اور امیر موصوف اپنی سواری پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا، اس کے فوراً بعد ایک سوار امیر کی طرف سے سو دینار لے کر حاضر ہوا، اور اس کو قبول کرنے کی استدعا کی، شیخ نے وہ رقم لیکر مکاری کو دیدی اور فرمایا کہ ہم نے فتوح پر معاملہ کیا تھا اور یہ بہرحال فتوح ہی ہے، سوار نے واپس جاکر امیر سے یہ واقعہ بیان کیا تو اس نے دوبارہ سو دینار پھر بھجوا دیے، شیخ نے یہ بھی مکاری کو دیدیے اور جامع مصر پہنچ کر جب سواری سے اترے تو الٹے مکاری سے معذرت کی اور اس کو دعا دی۔

اس موقع پر شیخ ہی کا ایک شعر نقل کرنے کو جی چاہتا ہے، فرماتے ہیں:-

وکل أذی فی الحب منک اذا بدا جعلت لہ شکری مکان شکیتی[1]

(محبت میں جو اذیت بھی تیری طرف سے پہنچتی ہے میں شکایت کے بجائے اس پر شکریہ ادا کرتا ہوں۔)

(باقی)

[1] دیوان ابن الفارض ص ۲۸

ارمغان سلیمان

حضرت سید سلیمان ندوی کا اصل میدان تو مذہبی و علمی تھا، اور اس میں انھوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیے ہیں وہ سب منظر عام پر آچکے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ شعر و ادب کا بھی بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، اور قریب قریب سبھی اصناف سخن میں طبع آزمائی فرماتے تھے، انکی بعض بعض نظموں اور شعروں کی علامہ اقبال اور جناب اکبر الہ آبادی جیسے ارباب کمال و اساتذہ سخن تک نے داد دی ہے، انکے لائق مسترشد مولوی غلام محمد صاحب حیدرآبادی مصنف تذکرۂ سلیمان نے انکے تمام کلام کا مجموعہ ارمغان سلیمان کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں مختلف عنوانات کے تحت انکی زندگی کے ہر دور کا کلام آگیا ہے۔ قیمت تین روپئے۔

اسلامی ہند کی علمی خودداری
الدرۃ الثمینۃ لملا عبدالحکیم سیالکوٹی
اور
شاہجہاں اور نواب سعد اللہ خاں

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اترپردیش

(۲)

تہافت الفلاسفہ کے بعد

"تہافت الفلاسفۃ" کی اشاعت سے فلاسفہ کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی، شیخ بوعلی سینا اور اس کے پیشروؤں نے فلسفہ کی جو فلک بوس عمارت قائم کی تھی، امام غزالی کے رد اور اعتراضات کے بعد ریت کی دیوار کی طرح زمین بوس ہوگئی، اس صورت حالی کا مقابلہ کرنے کے لیے "غزالی" ہی جیسا عبقریٔ وقت درکار تھا، مگر وہ "فلسفیانہ عبقریت" جو کندی سے شروع ہوئی تھی اور بوعلی سینا کے یہاں اپنے شباب کو پہنچی، اب اپنے دن ختم کر چکی تھی، پھر فلاسفہ معاشرہ میں اس درجہ مطعون و مبغوض ہوگئے کہ وہ کھل کر اپنے فلسفی ہونے کا اعلان بھی نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ عمر خیام جو امام غزالی کا ہم عصر تھا، اپنے فلسفیانہ رجحانات کی بنا پر آزادی کے ساتھ گھر سے بھی نکل نہیں سکتا تھا، ابن القفطی نے "اخبار العلماء باخبار الحکماء" میں لکھا ہے :-

"اور جب اس کے معاصرین نے اس کے دین و مذہب پر اعتراضات کیے اور اس کے معتقدات کو جنھیں وہ چھپاتا تھا بے نقاب کیا تو اسے اپنی جان کا خوف ہوا اور اپنی زبان اور قلم

کو روک لیا اور حج کے لیے چلا گیا..... اور جب بغداد پہنچا اور اس کے ہم مسلک اس سے ملنے آئے تو اس نے گھر کا دروازہ بند کر لیا"۔

یہ مشرق کی کیفیت تھی، مغرب (اندلس) کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ تفلسف کے الزام میں ابن رشد اور اس کے پیشروؤں کو جن شدائد کا سامنا کرنا پڑا، تاریخ کے صفحات اس کے شاہد ہیں، پھر بھی ابن رشد نے ہمت نہ ہاری اور یونانی فلسفہ کی سر بفلک عمارت کو جسے امام غزالی کے شدید حملوں نے ہلا کر رکھ دیا تھا، اپنی سعی پیہم اور زور استدلال سے گرنے سے بچا لیا، اور امام غزالی کے اعتراضات کا دوبدو جواب دیا، اس کا کہنا تھا کہ امام صاحب کے اعتراضات منطقی و برہانی نہیں ہیں، بلکہ محض اقناعی ہیں، چنانچہ "تہافت الفلاسفہ" کے رد میں "تہافت التہافت" کے عنوان سے اس نے جو کتاب لکھی ہے، اس کے مقدمہ میں لکھتا ہے:

ان الغرض فی هذا القول ان	اس کتاب میں ہماری غرض یہ ہے کہ ان اقوال
نبین مراتب الاقاویل المثبتة	کے مراتب کو جو امام غزالی کی "تہافت الفلاسفہ"
فی کتاب التهافت فی التصدیق	میں ثابت کیے گئے ہیں، باعتبار تصدیق و اقناع
والاقناع وقصور اکثرها عن رتبة	کے بیان کریں اور یہ بتائیں کہ ان میں سے
الیقین والبرهان۔	اکثر یقین و برہان کے درجہ تک پہنچنے سے
(تہافت التہافت لابن رشد، ص ۲)	قاصر ہیں۔

اس کے بعد اس نے امام غزالی کی ایک ایک بات کو لیا، خواہ وہ فلاسفہ پر اعتراض ہو یا فلاسفہ کے اعتراض کا جواب اور اسے باطل کرنے کی کوشش کی، اس طرح فلسفہ کو عہد پیری میں بھی ایک جوان ہمت مددگار مل گیا جس نے ارسطاطالیسی فلسفہ کی نشأۃ ثانیہ کا فریضہ انجام دیا۔ ظاہر ہے اس کتاب کی اشاعت سے فلاسفہ کو کس قدر مسرت ہوئی ہوگی اور متکلمین کو کس قدر

صدمہ پہنچا ہوگا۔ ادھر ملک کے سیاسی حالات میں انتشار برپا تھا، تاتاریوں کی غارتگری کچھ دن بعد
شروع ہوگئی، انھیں اسلام کی حمایت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، اس سے اسلام دشمن قوتوں بالخصوص
فلسفہ کو بڑی شہ ملی اور اس تصادم افکار و آراء نے بڑی شدید شکل اختیار کرلی،

مغرب میں تو ابن رشد کے بعد اس پایہ کا کوئی فلسفی پیدا نہیں ہوا، مگر مشرق میں صورت حال
مختلف تھی، یہاں زوال بغداد کے بعد بڑے عظیم المرتبت اور جلیل القدر مفکر پیدا ہوئے جو
بیک وقت فلسفی اور متکلم تھے، اس لیے دونوں راستوں کے نشیب و فراز سے واقف تھے،
جیسے محقق نصیر الدین طوسی، قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی، اثیر الدین ابہری، سراج الدین
ارموی، شمس الدین خسروشاہی، رفیع الدین جیلی، قطب الدین رازی، شمس الدین مبارک شاہ وغیرہم۔
ان کے علاوہ یہودی مفکرین نے بھی اس نزاع میں فلاسفہ کی اعانت کی۔ ان میں ابن کمونا
خاص طور سے مشہور ہے۔

اس کے نتیجہ میں فلسفہ اور کلام کی نزاع جو ایک حد تک امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ"
اور ابن رشد کے "تہافت التہافت" کی جنگ تھی، بڑے زور و شور سے چلتی رہی، حتی کہ تاتاریوں
کے قبول اسلام، ان کی حکومت کے اختتام اور ان کی جگہ راسخ العقیدہ مسلمان فرمانرواؤں
کی سلطنت کے قیام کے زمانہ میں بھی اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں ہوئی، مگر اس سے یہ فائدہ
بھی ہوا کہ اس قیل و قال سے اسلام کی فکری ثروت میں بیش بہا اضافے ہوتے رہے۔

تہافتین پر محاکمہ

جب زمانہ میں تاتاری لٹیروں کی چیرہ دستی سے عالم اسلام میں قیامت صغریٰ
برپا تھی، اسی زمانہ میں ایشیائے روم کے اندر عثمانی سلطنت کی بنیاد پڑ رہی تھی، اس حکومت
نے قلیل عرصہ میں دنیا کی عظیم الشان مملکتوں میں نمایاں مقام پیدا کرلیا، اس سلطنت کا سب سے
عظیم تاجدار سلطان محمد فاتح تھا، جو تاریخ میں فتح قسطنطنیہ کے لیے مشہور ہے، سیاسی عظمت

کیساتھ ساتھ اس کا عہد ثقافتی اور علمی سرگرمیوں کی سرپرستی کے لیے بھی مشہور ہے، یہی زمانہ
ترکی میں علم کلام کی ترقی کا "عہد زریں" ہے، چنانچہ فتح قسطنطنیہ کے علاوہ سلطان محمد فاتح کا
سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مولیٰ علاء الدین طوسی اور مولیٰ خواجہ زادہ رحمہما اللہ تعالیٰ
سے امام غزالی کے "تہافت الفلاسفہ" اور ابن رشد اندلسی کے "تہافت التہافت" کے درمیان
محاکمہ کرنے کی فرمائش کی، دونوں فاضلوں نے فرمان سلطانی کی باحسن وجوہ تعمیل کی اور خواجہ زادہ
نے چار مہینہ میں اور مولیٰ علاء الدین طوسی نے چھ مہینے میں اپنے اپنے کارنامے بالترتیب "تہافت
الفلاسفہ" اور "کتاب الذخیرہ" کے نام سے بارگاہ سلطانی میں پیش کیے، قدرشناس سلطان نے
دونوں کو دس دس ہزار کا انعام دیا۔

فاضل مقالہ نگار (حافظ احمد علی خاں شوق) نے اسی عنوان کے اپنے مضمون (شائع شدہ
معارف اکتوبر ۱۹۲۲ء) میں لکھا تھا:۔

"خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی، چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی
کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام
لکھا ہے، سلطان محمد خاں دوم نے اپنے دربار کے بڑے فلسفی موجی فواردی (؟) سے اس کا
محاکمہ لکھوایا ہے، جو کتاب الذخیرہ کے نام سے چھپ گئی ہے"۔

(۱) سلاطین کو اس مسئلہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی، روم میں تو سلطان محمد فاتح نے محض علمی
سرپرستی اور علماء کی ہمت افزائی کے لیے "محاکمہ لکھنے" کا امتحان لیا تھا، رہا ہندوستان
تو شاہجہاں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، مگر جب سفارت خانہ کے عملہ کی بوالفضولی کے ہاتھوں
ہندوستان کا علمی وقار ایرانی فضلاء کے مقابلہ میں کھو یا گیا تو بادشاہ (شاہجہاں) کو اس کی
بحالی کا خیال پیدا ہوا، اور محض اس کھوئے ہوئے وقار کی بحالی کے لیے اس نے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

سے یہ رسالہ (الدرۃ الثمینہ) لکھوایا۔

[ملاحظہ ہو محلات نظریہ میں سے شمارہ (۱۳)، (۱۶)۔ مزید تفصیل "الدرۃ الثمینہ کا تاریخی پس منظر" میں آرہی ہے]

(۲) مولیٰ علاء الدین طوسی نے "تہافتین" پر محاکمہ "کتاب الذخیرہ" کے نام سے عہد شاہجہانی یا پیش نظر رسالہ "الدرۃ الثمینہ" کے "پس و پیش" زمانہ میں نہیں لکھا تھا، بلکہ تقریباً دو سو سال پہلے لکھا تھا۔ "الدرۃ الثمینہ" ۱۰۵۱ھ میں اور "کتاب الذخیرہ" سلطان محمد فاتح کے زمانہ حکومت ۸۵۵ھ لغایت ۸۸۶ھ میں لکھی گئی۔

(۳) لفظ موحی فوار وی بالکل بے معنی ہے، اصل لفظ مولیٰ علاء الدین طوسی ہے۔

(۴) سلطان محمد فاتح جس کے عہد حکومت میں "کتاب الذخیرہ" لکھی گئی، شاہجہاں کا ہمعصر نہیں تھا، اور نہ اس نے ان کے پاس مادی یا علمی تحفے تحائف بھیجے تھے، شاہ جہاں کے زمانہ میں سلطان محمد فاتح کو وفات پائے ہوئے تقریباً ڈیڑھ دو سو سال ہو چکے تھے، مگر فاضل مقالہ نویس نے لکھا تھا:۔

"قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم تحفہ تحائف اور اپنے ملک کی مصنوعات بھیجا کرتے تھے وہاں اپنے دربار کے شعراء کی غزلیں، قصائد و دواوین اور علماء و فضلاء کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے، چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان دوم کے درمیان اسی قسم کے تعلقات قائم تھے۔"

اس لیے یہاں فاضل مقالہ نویس سے تسامح ہوا ہے۔

تہافت الفلاسفہ لخواجہ زادہ اور کتاب الذخیرہ کا موازنہ

مولیٰ خواجہ زادہ نے پہلے تو اقاویل فلاسفہ کے ابطال و تردید کے باب میں امام غزالی کی خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا:۔

ان الامام المحقق حجۃ الاسلام ابا حامد محمد بن محمد الغزالی .... اخترع رسالۃ عذراء فی ابطال اقاویل الحکماء وسماھا تھافت الفلاسفۃ وبین فیھا تناقض عقائدھم وضعف قواعدھم وبطلان معاقدھم۔ واودع غرائب نکت کانت کامنۃ تحت الاستار واوضح من بعدہ طرقاً فجاجاً کانت مختفیۃ عن الابصار۔ جزاہ اللہ عنا وعن کافۃ المسلمین خیر الجزاء فی دار القرار۔" (تہافت الفلاسفہ لخواجہ زادہ علی حاشیہ تہافت الفلاسفہ للامام الغزالی طبع مصر، جلد اول صفحہ ۲-۳)

امام محقق حجۃ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی نے ..... اقاویل حکماء کے ابطال میں ایک اچھوتا رسالہ لکھا ہے جس کا نام تہافت الفلاسفہ رکھا تھا، اور اس میں ان کے عقائد کے اندرونی تضادات و تناقضات، ان کے اصول و قواعد کی کمزوری اور ان کے معاقد و مواقف کے بطلان کا بیان ہے اور عجیب عجیب نکات کو جو پردوں کے نیچے پوشیدہ تھے، اس رسالہ میں ودیعت کیا۔ اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے ایسے طریقوں کو واضح کیا جو نظروں سے اوجھل تھے، اللہ تعالیٰ انھیں ہماری طرف سے اور تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔

اس کے بعد سلطان محمد فاتح کی فرمائش کا ذکر کیا ہے:۔

ثم انی اُمرت من جناب السلطان .... ابو الفتح محمد خان .... بان املی کتاباً علی مثالھا ...... فبادرت الی مقتضی الاشارۃ و امتثلت بواجب الطاعۃ (تہافت الفلاسفہ خواجہ زادہ علی حاشیہ تہافت الفلاسفہ للامام الغزالی جلد اول صفحہ ۴)

مجھے ..... سلطان ابو الفتح محمد خاں ..... کی جانب سے حکم دیا گیا .... کہ تہافت الفلاسفہ امام غزالی کے انداز پر ایک کتاب لکھوں، پس میں نے حکم سلطانی کی تعمیل و بجا آوری میں جلدی کی

اس کے بعد انھوں نے مجوزہ کتاب کے مقصد تالیف اور موضوع کی یہ وضاحت کی کہ ہم فلسفہ طبیعیات و الٰہیات کے ان اصولوں کو باطل کرنا چاہتے ہیں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں:

فنرید ان نحکی فی هذه الرسالة من قواعدهم الطبیعیة والالٰهیة ما اورده الامام حجة الاسلام مع بعض آخر مالم یورده بادلتها المعول علیها عندهم علی وجهها ثم نبطلها ارغاماً للمتفلسفة المبطلین واعظاماً لاهل الحق والیقین۔ (تہافت الفلاسفہ لخواجہ زادہ جلد اول صفحہ، حاشیہ)

ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس رسالہ میں طبیعیات والٰہیات کے اندر جو فلاسفہ کے اصول و قواعد ہیں اور جنھیں امام غزالی نے بیان کیا ہے اور اسکے ساتھ کچھ اور باتوں کو بھی جن کا امام حسنانے ذکر نہیں کیا تھا بیان کریں، نیز ان دلائل و براہین کا جن پر فلاسفہ نے تکیہ کیا ہے اعادہ کریں۔ بعد ازاں باطل پرست فلاسفہ کے خلاف اور اہل اسلام کے طرفداری کی صحت اور انکے مسلک کی تنظیم و اجلال کے لیے ہم اہل فلسفہ کے قواعد کی تردید کریں۔

غرض مولیٰ خواجہ زادہ نے یہ کتاب فلسفہ کی تردید و ابطال ہی کے مقصد سے لکھی تھی لیکن انکے حریف مولیٰ علاء الدین طوسی نے یہ کاوش محض احقاق حق کے لیے کی تھی، چنانچہ مقدمہ کتاب میں فرماتے ہیں:

کان برهة من الزمان یتلجلج فی صدری ویختلج فی قلبی ان اکتب فی المسائل الالٰهیة وما یتعلق بها بعض ما تقرر لی وتحقق عندی..... ولکنه یعوقنی عن ذلک عدوان زمانی..... الی ان

عرصہ سے میرے دل میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ مسائل الٰہیہ اور انکے متعلقات کے بارے میں اپنی تحقیقات قلمبند کروں..... لیکن زمانہ کی ناسازگاری اس خواہش کے بروئے کار لانے میں مانع رہی..... تاآنکہ سلطان

اشار الی..... السلطان ابو الفتح محمد بن مراد خان ان انظر فی الرسالة المسماة بالتهافت الفلاسفة التی الفها الامام..... الغزالی رحمة الله تعالیٰ علیه..... واکتب علی اسلوبه ما یسنح لی ویظهر عندی فی کلام الفریقین وقواعد الطریقین من جهات التضعیف والترجیح و الابطال والتصحیح (کتاب الذخیرہ ص۳)

ابو الفتح محمد خان نے مجھے اشارہ کیا..... کہ میں امام غزالی رحمہ اللہ تعالیٰ کے رسالہ تہافت الفلاسفہ کا مطالعہ کرکے اسکے انداز پر متکلمین و فلاسفہ نیز انکے مناہج کے باب میں جو کچھ میری رائے ہو اسے تحریر کروں اور فریقین کے دلائل و براہین کی کمزوری اور ترجیح اور ان کے صحیح اور باطل ہونے کے متعلق اپنی تحقیق ثبت کردوں۔

اور "کتاب الذخیرہ" کے مطالعہ سے اس کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ انھوں نے احقاق حق ہی صحت نقل و حکایت میں دونوں فریقوں (حکماء و متکلمین) کے دلائل و براہین پوری غیر جانبداری کے ساتھ رقم کرنے میں پوری احتیاط ملحوظ رکھی ہے، وہ خود بھی اس کا اقرار کرتے ہیں۔

وشرطت علی نفسی عند ماشرعت فی هذا الخطب الخطیر والامر الکبیر ان لا اکتب الا ما اثبت عندی بالقطع انه الحق والصواب (کتاب الذخیرہ ص ۴-۵)

جب میں نے اس اہم کام کو شروع کیا تو اپنے اوپر یہ شرط عائد کرلی کہ میں اس کتاب میں صرف وہی بات درج کروں گا جو میرے نزدیک قطعی طور پر ثابت ہو کہ وہ حق اور صواب ہے۔

اس طرح مولیٰ خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" اور مولیٰ علاء الدین طوسی کی "کتاب الذخیرہ" نے اس نزاع کو جو امام غزالی کے زمانہ سے چلی آرہی تھی، بڑی خوش اسلوبی سے ختم کیا،

چنانچہ ابن المؤید آماسی جب خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" لے کر محقق دوانی (المتوفی ۹۰۸ھ) کے پاس پہنچے تو وہ اسے پڑھ کر بہت زیادہ خوش ہوئے، اور ان الفاظ میں کتاب کی تعریف فرمائی:

رضی اللہ تعالیٰ عنک وعن مؤلفہ	اللہ تعالیٰ تم سے اور مصنف سے راضی ہو
قد کان فی نیتی ان اکتب فی ھذا	کہ تم نے مجھے یہ کتاب دکھا دی، میرا بھی ارادہ
الباب کتاباً ولو کتبت قبل ان اری	اس موضوع پر لکھنے کا تھا۔ اگر اسے دیکھے بغیر
ھذا الکتاب لافتضحت	لکھ ڈالتا تو کیسی بدنامی ہوتی۔

(الشقائق النعمانیہ علی ہامش تاریخ ابن خلکان جلد اول ص ۲۱۰)

ایران میں تفلسف کا احیاء محقق دوانی نے ۹۰۸ھ میں وفات پائی، اس کے اگلے سال ایران میں صفوی حکومت قائم ہوئی، سیاسی انقلابات ہمیشہ اپنی جلو میں فکری انقلابات بھی لے کر آتے ہیں، ایران میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا، صفوی حکومت قوم پرستی کے نام سے وجود میں آئی، مگر قوم پرستی احیائیت کو اور احیائیت "باستان پرستی" کو پیدا کرتی ہیں، اس لیے ایران میں بھی اس "باستان پرستی" کا چرچا ہوا اور اس کے نتیجے میں تفلسف کے ساتھ فضلائے عہد کا اعتناء انتہائی حد کو پہنچ گیا، یوں بھی ایران کو قدیم زمانہ سے اپنے فلسفہ و حکمت پر ناز تھا اور وہ خود کو علم و حکمت کا گہوارۂ اولین سمجھتا تھا۔

فلسفہ کے ساتھ اس شغف بے پایاں نے ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کو قومی ہیرو بنا دیا۔ اور ان کی جملہ تعلیمات کو معصوم عن الخطا سمجھ لیا گیا، لیکن امام غزالیؒ نے مسائل ثلثہ (قدم عالم، انکار علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ اور انکار معاد جسمانی) کی بنا پر ان دونوں کی بالواسطہ تکفیر کی تھی جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، اس لیے احیائیت، باستان پرستی اور تفلسف پسندی کے نتیجے میں اس زمانہ میں فارابی اور ابن سینا کے مواقف کی تصویب و تصحیح کا ایران میں عام

رجحان تھا، یوں بھی خود سنجیدہ مفکرین ان مواقف پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے، چنانچہ

الف۔ قدم عالم کے انکار کے سلسلے میں محقق دوانی نے لکھا ہے:-

"بعض متاخر محدثین قدم جنسی کے قائل ہیں (بایں طور کہ افراد عالم میں سے کوئی نہ کوئی فرد بر سبیل تعاقب و تداول موجود ہے) اور میں نے ابن تیمیہؒ کی کسی کتاب میں عرش کے بارے میں یہ قول دیکھا ہے۔"

پھر "قدم عالم" کا انکار اس اصول پر مبنی تھا کہ اگر کسی شے سے کوئی امر قصداً اختیاری طور پر صادر ہو تو وہ ضرور حادث ہو گا

"اذا لصادر عن الشئ بالقصد والاختیار حادث بالضرورۃ۔"

مگر بعد کے متکلمین نے اس کلیہ کی صحت سے انکار کر دیا۔

اس طرح قدم عالم سے انکار کے قول میں اب وہ پہلی سی سختی نہیں رہی، اور ان اکابر مفکرین نے لچک کے لیے اس میں گنجایش پیدا کر دی۔

اسی طرح باری تعالیٰ کے "عالم جزئیات حادثہ" ہونے نہ ہونے کے بارے میں فلاسفہ کے مواقف کو زیادہ دقت نظر سے سمجھنے کی کوشش کی گئی، اور اس بات پر زور دیا جانے لگا کہ "علم باری تعالیٰ بجزئیات حادثہ" کے بارے میں شیخ بو علی سینا نے جو لکھا ہے، اس کی مراد کو پوری سمجھنے میں فراخ دلی سے کام نہیں لیا گیا۔

مگر سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ "حشر اجساد" کا تھا، اس سلسلے میں فارابی کے اقوال کے اندر بہت زیادہ اضطراب ہے، کہیں اس نے اس کا قطعی انکار کیا ہے اور کہیں اقرار۔ یہی حال ابن سینا کا ہے۔

پھر ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کے متبعین کے علاوہ جو ان کے مواقف کو نیک محمل

پر محمول کرنا چاہتے تھے، دوسرے مفکرین بھی تھے جو نئے نئے تصورات پیش کر رہے تھے، جیسے میر باقر داماد، جنھوں نے "حدوث دہری" کا نظریہ وضع کیا، یا ان کے شاگرد ملا صدرا (جن کی "شرح ہدایۃ الحکمۃ" آج بھی "صدرا" کے نام سے مدارس عربیہ کے معقولات کے اعلیٰ نصاب میں شامل ہے) جنھوں نے نفس انسانی کے "جسمانیۃ الحدوث و روحانیۃ البقا" ہونے کا تصور پیش کیا، ملا صدرا کے متاخر پیرووں میں شیخ احمد احسائی نے "معاد" کے سلسلے میں "بدن ہورقلیائی" کے عقیدے کی تجدید کی، جسے شہاب الدین سہروردی مقتول (شیخ الاشراق) نے "مطارحات" میں پیش کیا تھا۔

لیکن زیادہ قیل و قال کا موضوع "فلسفہ کے شیخین" (فارابی اور ابن سینا) ہی کے افکار رہے، اور اہل علم ان ہی کے مواقف کو نیک محمل پر محمول کرنے میں اپنی علمی سرگرمیوں کو منحصر رکھتے تھے، چنانچہ جب کسی فاضل کے علم و فضل کو جانچنا ہوتا تو کہا جاتا کہ مسائل ثلاثہ کے بارے میں، جن کے اندر امام غزالی نے فارابی اور بوعلی سینا کے مواقف کی تکفیر کی ہے، حکماء کے مسلک کی (جو قدم عالم کے قائل اور معاد جسمانی اور شمول علم باری بجزئیات مادیہ کے منکر تھے) تاویل کرو۔

اسی بنا پر خلیفہ سلطان (وزیر دانشور عراق) نے ہندوستانی فضلا (محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس، جنھیں اپنی معقولات دانی پر ناز تھا) سے کہا تھا:-

"امام غزالی در مسئلہ قدم عالم و نفی علم واجب (تعالیٰ شانہ عما یقول الظالمون فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جہلاً مرکباً) بجزئیات مادیہ و نفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی و شیخ بوعلی سینا نمودہ و جمیع تاویل کلام حکما کردہ اند - ایں مراتب را تقریر باید کرد۔"

غرض جن مسائل پر ان مدعیان علم و فضل سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا تھا، تین تھے: قدم و حدوث عالم، اثبات و انکار حشر اجساد اور شمول و عدم شمول علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ

مگر فاضل مقالہ نویس جنھوں نے اس بحث کے علمی و فکری پس منظر کو زیادہ در خور اعتنا نہیں سمجھا، انھیں دو ہی مسئلوں میں منحصر کر دیا اور "حشر اجساد" کے مسئلہ کو چھوڑ دیا، حالانکہ اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پیشتر فاضل مقالہ نگار کی دو اور قیاس آرائیوں پر تنبیہ مناسب معلوم ہوا، ملاحظہ ہو محلات نظریہ میں سے (۵) اور (۶)، فرماتے ہیں:-

"ہندوستان سے ترکی ان کتابوں کے پہنچنے کی صورت یہ معلوم ہوئی کہ قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم تحفہ تحائف اپنے ملک کی مصنوعات کا بھیجا کرتے تھے، وہاں اپنے دربار کے شعراء کی غزلیں، قصائد، دواوین اور علماء و فضلاء کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے، چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان روم کے درمیان اس قسم کے تعلقات قائم تھے، اور اس طرح شاہی تحائف کے ضمن میں ہندوستان کے اس مایۂ ناز حکیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات ترکی پہنچی ہیں۔"

اوپر تنبیہ ہو چکا ہے کہ ممالک اسلامیہ میں علم و ادب کی نشر و اشاعت شاہان وقت کے "ارسال ہدایا و تحف" سے بے نیاز تھی۔ اور اگر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات "شاہی تحائف کے ضمن میں ترکی پہنچیں" تو ترکی کے علماء کی تصانیف مثلاً "خیالی" کس طرح ہندوستان آکر داخل درس ہوئیں۔ پھر فاضل مقالہ نگار کو ایک غلط فہمی یہ ہو گئی تھی کہ شاہ جہاں اور سلطان محمد فاتح (جس کے ایماء سے خواجہ زادہ نے "تہافت الفلاسفہ" اور مولیٰ علاء الدین طوسی نے "کتاب الذخیرہ" لکھیں) ہم عصر تھے، حالانکہ دونوں میں ڈیڑھ سو سال کا تقدم و تاخر تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ علمی کتابوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا اور اہل علم میں مقبول بنانا خود علماء ہی کی کوششوں کی رہین منت تھا، چنانچہ جب فیروز تغلق نے مولانا جلال الدین رومی کو مدرسہ فیروز شاہی کا صدر مدرس مقرر کیا تو انھوں نے اپنے استاد قطب الدین رازی کی شرح شمسیہ کو داخل نصاب کیا، اسی طرح جب اس نے بالا بندسری کے مدرسہ میں مولانا نجم الدین سمرقندی کو صدر مدرس بنایا تو انھوں نے اپنے ہم وطن شمس الدین سمرقندی کی کتاب "الصحائف فی علم الکلام" داخل درس کیا اور یہ دونوں کتابیں دسویں صدی کے آغاز تک جبکہ مولانا عبداللہ طلبنی اور شیخ عزیز اللہ ملتانی نے معقولات کی کتابیں لاکر داخل درس کیں، منطق و فلسفہ کے اعلیٰ نصاب کی آخری کتابیں سمجھی جاتی تھیں۔

طاش کبریٰ زادہ نے لکھا ہے کہ جب مولی ابن المؤید اماسی ترکی سے ایران گئے اور محقق دوانی کی خدمت میں پہنچے تو موخر الذکر نے دریافت کیا، ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟ اس پر انھوں نے مولیٰ خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ" ان کی خدمت میں پیش کی جسے مطالعہ کرنے کے بعد وہ بہت زیادہ محظوظ ہوئے، فرماتے ہیں:۔

وسمعت عن ثقة ان المولی	میں نے ایک قابل اعتماد شخص سے سنا کہ
ابن المؤید لما وصل الی خدمة	جب مولیٰ ابن المؤید الاماسی محقق دوانی
المولی الدوانی، قال له: بای	کی خدمت میں پہنچے تو محقق نے ان سے
هدية جئت الينا۔ قال	دریافت کیا، ہمارے لیے کیا تحفہ لائے ہو؟
کتاب لتهافت لخواجه زاده	کہا: مولیٰ خواجہ زادہ کی "تہافت الفلاسفہ"
...... قال قد فحت الیه	..... مولیٰ ابن المؤید کہتے ہیں کہ میں نے
الکتاب لمذکور فطالعه مدة	کتاب مذکورہ انھیں جس کا انھوں نے
(الشقائق النعمانیه برحاشیه تاریخ ابن خلکان ۱۵، ص ۲۱۶)	عرصہ تک مطالعہ کیا۔

اس کے بعد جو ان کا تاثر تھا، وہ اس سے پہلے نقل ہو چکا ہے، ظاہر ہے کہ اس تحسین و آفریں کے بعد یہ کتاب ایران میں کس درجہ مقبول ہوئی ہوگی۔

اسی طرح جب دسویں صدی کے آخر میں امیر فتح اللہ شیرازی اکبر کی طلب پر ہندوستان آئے تو انھوں نے محقق دوانی اور دوسرے اکابر علمائے ولایت دایران و ماوراء النہر) کی مصنفات کو لاکر یہاں مقبول کرایا اور اس کے بعد ان کتابوں کی تعلیم و تدریس کا عام رواج ہو گیا، چنانچہ مولانا آزاد بلگرامی نے آثر الکرام میں امیر فتح اللہ شیرازی کے تذکرے میں لکھا ہے:۔

"تصانیف علمائے متاخرین ولایت مثل محقق دوانی و میر صدر الدین و میر غیاث الدین منصور و میرزا جان، میر بہندوستان آورد۔ و در حلقہ درس انداخت۔ و جم غفیر از حاشیہ محفل میر استفادہ کردند۔ و از اں عہد معقولات را رواجے دیگر پیدا شد۔"

(ماثر الکرام ص ۲۳۸)

نزہتہ الخواطر جلد ہشتم از مولانا ابوالحسن علی ندوی

مترجمہ

جناب مولوی شمس تبریز خاں صاحب

اہل علم مولانا حکیم سید عبدالحئی صاحبؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء (م۔ ۱۳۴۱ھ / ۱۹۲۳ء) کی شہرۂ آفاق کتاب نزہتہ الخواطر سے واقف ہیں، یہ کتاب عربی زبان میں آٹھ جلدوں میں ہے، اور ہندوستان و بیرون ہند میں اس موضوع پر سب سے جامع کتاب سمجھی جاتی اور سند کا درجہ رکھتی ہے، اس کی سات جلدیں عرصہ ہوا دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہو چکی ہیں، آخری جلد جو اس صدی کے مشاہیر اور معاصر شخصیتوں کے حالات پر مشتمل ہے، ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اب مستشرقین کی تحریک اور دائرۃ المعارف کے ذمہ داروں کے مسلسل تقاضوں پر مصنف مرحوم کے فرزند مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اس پر نظر ثانی کر کے اس کو مکمل کر دیا ہے، اسکی تکمیل میں پورا ایک سال صرف ہوا، زیر نظر مضمون اس حصہ کے تعارف اور تکمیل کی دشواریوں اور اس کی نوعیت کو واضح کرنے کے لیے دمشق کے مشہور اور موقر رسالہ "مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ" کے لیے عربی میں لکھا گیا تھا، مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے اس کو معارف کے لیے اردو میں منتقل کیا ہے، صاحب مضمون نے اس پر نظر ثانی کر کے کچھ مفید اضافے بھی کر دیے ہیں۔

اسلامی تاریخ کا ہر شناسا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ہندوستان عالم اسلام

کی طلائی زنجیر میں ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتا ہے، اور اسلامی افکار و علوم میں اپنا خصوصی کردار ادا کر چکا ہے، مولانا سید عبدالحئی حسنیؒ کی کتاب "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند"[1] پر ایک اجمالی نظر ڈالنے ہی سے اس دعوے کی تصدیق ہو جائے گی کہ اسلامی علوم و فنون کی خدمت میں ہندوستان کا حصہ کسی دوسرے ملک سے کم نہیں بلکہ بیشتر ممالک سے زیادہ ہے۔

یوں تو ہندوستان میں اسلامی قافلوں کی آمد کا سلسلہ پہلی صدی ہجری کے وسط ہی سے شروع ہو گیا تھا لیکن ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں عالم اسلام پر تاتاریوں کے حملہ کے بعد یہاں مسلمانوں میں ہندوستان کی طرف ہجرت کا عام رجحان پیدا ہو گیا تھا، اور وہ اس عہد میں سب سے مضبوط اسلامی حکومت کا مرکز اور عالم اسلام کے ایک سرے پر واقع ہونے کی وجہ سے اسلام کا سب سے مضبوط قلعہ سمجھا جاتا تھا، یہ رجحان ایران، ترکستان اور ماوراءالنہر میں زیادہ تھا، کیونکہ ساتویں صدی کے آغاز میں یہی علاقے تاتاری یورش کا خاص طور سے نشانہ بنے تھے، ہندوستان کی اسلامی حکومت علم و فن کے ان قافلوں کا بڑی فراخدلی سے استقبال کرتی تھی اور اہل فضل و تقویٰ کے لیے اس کا سینہ ہمیشہ کشادہ رہتا تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ وہ تاتاری جن کو ناقابل شکست سمجھ لیا گیا تھا، جب ہندوستان

---

[1] اس کتاب میں ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی دور کے اس علمی و تصنیفی کام کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے جو ہندوستانی علماء کے ہاتھوں انجام پایا ہے، پہلے نصاب تعلیم کی تاریخ اور ہر عہد میں اسکا خاکہ پیش کیا گیا ہے، پھر ہر علم و فن میں ہندوستانی مسلمانوں کی تصنیفات کی مفصل روداد اور فہرست پیش کی گئی ہے، مصنف نے اسکا نام معارف العوارف فی انواع العلوم والمعارف رکھا تھا، دمشق کی عربی اکیڈمی "المجمع العلمی العربی" نے جو اب مجمع اللغۃ العربیہ کے نام سے موسوم ہے، ۱۳۷۷ھ میں اسکو "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" کے نام سے شائع کیا، اس کا اردو ترجمہ بھی تیار ہے جو انشاءاللہ دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوگا۔

برحملہ آور ہوئے تو ان کو منہ کی کھانی پڑی اور ان کا زور ٹوٹ گیا، تاریخ بتاتی ہے کہ صرف علاء الدین خلجی (۶۹۶ھ - ۷۱۶ھ) پر تاتاریوں کے پانچ حملے ہوئے لیکن علائی فوجوں نے انھیں شکست فاش دیکر ان کا منہ پھیر دیا اور ہمیشہ کے لیے ان کے حوصلے پست ہوگئے، اس طرح علمائے اسلام کو درس و تالیف اور اشاعت علم و دین کا پُرسکون موقعہ ملا، ہندوستان میں اسلامی ثقافت میں اس وقت برگ و بار آئے جب سارا عالم اسلام خزاں کی لپیٹ میں تھا اور علم و ادب و فن کی دنیا میں ہر طرف انحطاط و زوال چھایا ہوا تھا، عالم عربی جس پر عجمی النسل فرمانرواؤں اور اور مصر و شام جن پر ترکی النسل ممالیک کی حکومت تھی، ذہنی اضمحلال اور علمی تعطل کا شکار تھے، ہر طرف تقلید عام تھی، ابداع اور اختراع (Originality) کا تصور ہی ختم ہوگیا تھا، اس تاریک عہد میں اسلام کا درخت ہندوستان میں نئے برگ و بار پیدا کر رہا تھا، دیہات و قصبات تک میں علماء و اہل نظر کے بے شمار حلقے قائم تھے، جن میں اہل قلم یکسوئی سے علمی خدمت میں مصروف تھے، مشائخ اور صوفیہ زہد و عبادت اور ارشاد و افادہ کے لیے خانقاہوں کو آباد کیے ہوئے تھے، ان کی اتنی کثرت تھی کہ اس زمانہ کی تاریخ و تذکرہ پڑھنے والے کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہاں علم و تالیف، تربیت قلب اور تہذیب نفس کے سوا کوئی اور مشغلہ ہی نہ تھا، اور علماء و صوفیہ کے علاوہ کوئی بستا ہی نہ تھا،

لیکن متعدد وجوہ سے ہندوستان عرب مورخین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہا، ایک بڑی وجہ تو یہی تھی کہ ہندوستان اس عالمی گذرگاہ سے الگ تھا جس سے علم و فن کے کارواں گذرتے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ فارسی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے تالیف و تصنیف کی زبان بھی بن گئی تھی، وہ تو کہیے حج کی تقریب سے علمائے ہند کو عرب جانے کا موقعہ ملتا تھا اور عقیدت کی کشش انھیں بار بار حجاز کھینچ لیجاتی تھی، بہت سے لوگ مستقل ہجرت کرکے وہاں کے

مشائخ سے علوم خصوصاً حدیث میں استفادہ کرتے تھے، اگر حج کی تقریب نہ ہوتی تو عالم عربی کو بھی کسی کولمبس کی ضرورت ہوتی جو اس انوکھی دنیا کا پتہ لگاتا،

اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ حافظ سخاوی نے اپنی مشہور کتاب "الضوء اللامع" میں (جو نویں صدی کے علماء کے حالات پر مشتمل ہے) ہندوستان کے صرف اٹھاسی علماء کا ذکر کیا ہے اور علامہ شوکانی نے ہندوستان سے قریب ہوتے ہوئے بھی "البدر الطالع" میں ساتویں صدی سے لیکر بارہویں صدی تک کے ہندوستانی علماء میں سے صرف سات کا ذکر کیا ہے، محبی نے "خلاصۃ الاثر" میں گیارہویں صدی کے علمائے ہند میں سے چودہ کا تذکرہ کیا ہے، حالانکہ ان کی کتاب میں جن شخصیات کا تذکرہ آیا ہے، ان کی تعداد بارہ سو نوے (۱۲۹۰) ہے، اسی طرح مرادی نے "سلک الدرر" میں بارہویں صدی کے صرف سات علماء کا تذکرہ لکھا ہے۔

طبقات اور تراجم رجال کی طرف علمائے ہند نے ہر دور میں توجہ کی ہے، جو طبعی بات بھی تھی اور اس کے بہت سے دواعی بھی تھے اور بعض بڑے مصنفین نے تو اس کو اپنا خصوصی موضوع بنا لیا تھا، "الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند" میں ان گرانقدر خدمات اور ان مردان کار کا ذکر آیا ہے جنھوں نے اس موضوع پر تصنیفات کا ایک وسیع ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے، لیکن یہ کام تمام تر یا اسکا بیشتر حصہ فارسی میں ہوا ہے، پھر ان میں اتنا اختصار ہے کہ ان کتابوں میں چند ہی شخصیتوں کے تراجم ہیں، تمام ہندوستان کا احاطہ نہیں کیا گیا، بعض کتابیں تو دو یا تین صدی کے حالات ہی پر ختم ہو جاتی ہیں، اور اکثر وہ ہیں جو کسی خاص طبقہ، مسلک یا کسی خاص فرقہ کے ساتھ مخصوص ہیں یا ان کے مصنفین میں ایک خاص طرح کا رجحان پایا جاتا ہے۔

اس لیے اس کی بڑی ضرورت تھی کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس خلا کو پُر کیا جاتا اور اس کے لیے ایک ایسی شخصیت سامنے آتی جس میں بلند حوصلگی، وسعت نظر،

علمی تنوع اور قوتِ مطالعہ کے ساتھ وسعتِ قلبی، علمی رواداری، فراخ دلی اور صبر و تحمل کی صفات
بدرجۂ اتم ہوتیں، ہندوستان کے مختلف مکاتبِ خیال اور مختلف علمی حلقوں اور روحانی
سلسلوں پر اس کی نظر وسیع ہوتی، عربی اور فارسی زبانوں کی کتابوں سے (جن میں یہ مواد
پایا جاتا ہے) وہ بے تکلف استفادہ کرسکتا اور اس عظیم کام یعنی ہندستان کا تعارف عالمِ اسلام
سے کرانے کے لیے وہ عربی زبان کا انتخاب کرتا، جو عالمِ اسلام کی بین الاقوامی زبان ہو، جسے اللہ نے
دوام بخشا ہے اور جس کو قرآن کی برکت نے زندہ جاوید بنا دیا ہے، اس کے لیے ایسی بے تکلف
اور رواں عربی لکھنے والے کی ضرورت تھی جو مقفّٰی اور مسجع عبارت اور صنائع و بدائع کی ان پابندیوں
سے آزاد ہو جن میں عام طور پر دورِ انحطاط کے عرب کے مصنفین اور انشاء پرداز گرفتار رہے ہیں۔

وہ بڑی مبارک گھڑی تھی جب مولانا حکیم سید عبدالحئی (۱۲۸۶ھ - ۱۳۴۱ھ) نے اس کارِ عظیم
کا بیڑا اٹھایا، حالانکہ اس وقت وہ ایک جوان طالب علم تھے، اور علم و ادب کے شہر لکھنؤ کے درسی حلقوں
سے اپنی علمی پیاس بجھا رہے تھے، اس صدی کے شروع میں انھوں نے علماء و مشاہیرِ ہند کی ایسی
تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا جو ہندستان میں داخلۂ اسلام سے اسوقت تک کے حالات پر مشتمل ہو، غالباً
یہ خیال انھیں اپنے محبوب استاذ مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کی زیرِ تصنیف کتاب کے جو اسی موضوع پر تھی، چند
اوراق دیکھکر آیا ہو، مگر یہ خیال انکی عمر و لیاقت سے اسوقت بلند تھا، لیکن ہمت بلند ماہ و سال
کے حسابات کی پابند نہیں ہوتی، انھوں نے اس کام کی تکمیل کا فیصلہ کرلیا اور اس کے لیے اپنی
ساری صلاحیتیں وقف کردیں، ہمارا اندازہ ہے کہ مسلسل تیس ۳۰ سال تک یہی کام انکی زندگی کا
عزیز ترین مشغلہ رہا ہے، یہ ان کی ہمت، ذہانت اور دوربینی تھی کہ انھوں نے کتاب کی زبان کیلئے
عربی کو ترجیح دی جو ہندستان میں انکے زمانے میں اپنے آخری نقطۂ زوال تک پہنچ چکی تھی، یہ زوال
ان درسی کتابوں کا نتیجہ تھا جو عرصہ سے ہندستان میں عربی نثر و انشاء کا واحد نمونہ بلکہ سدرۃ المنتہیٰ

سمجھی جاتی تھیں، یہ ایک علمی مہم جوئی تھی کہ اس طالب علم نے جس کا ادبی نشو و نما "مقاماتِ حریری" اور اس طرز
کی دوسری کتابوں کے ماحول میں ہوا تھا، ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھانے کا فیصلہ کیا جسمیں زبان و بیان
کے تنوع کی سخت ضرورت تھی اور جس کے لیے اس کے پاس عجمی اسالیبِ بیان کے سوا کوئی دوسرا نمونہ
نہ تھا، اسوقت ہندوستان کے عرب ممالک سے وہ ثقافتی تعلقات، اور مصر و شام کے مجلات و رسائل
اور تازہ تصنیفات کے پہنچنے کی وہ سہولتیں بھی حاصل نہیں تھیں جو آج میسر ہیں، یہ ان حالات و اسباب
کا تقاضا تھا کہ وہ یہ کتاب یا فارسی میں تصنیف کرتے جس پر اس زمانے کے علماء کی طرح انکو اچھی
قدرت حاصل تھی، یا اردو کا انتخاب کرتے جو ان کی مادری زبان تھی اور جس کے وہ ممتاز اہلِ قلم تھے۔
لیکن انھوں نے اپنے اور اپنے ملک کے ساتھ انصاف کیا کہ کتاب کی زبان عربی رکھی، اسلیے کہ فارسی
چراغِ سحری ہو رہی تھی اور اسکے سمجھنے والوں کا حلقہ روز بروز محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا تھا،
جہاں تک اردو کا تعلق ہے وہ ابھی اپنے ارتقاء کے منازل طے کر رہی تھی بہرحال وہ وسیع عالمِ اسلام
اور علمی دنیا کے لیے ذریعۂ تعارف نہیں بن سکتی تھی،

مصنف نے جب اس علمی و تصنیفی سفر کا آغاز کیا تو انھیں اسکا اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ
اتنا طول پکڑے گا اور مشکلات کا اس درجہ سامنا کرنا ہوگا اور اُن کتابوں سے نمٹنا ہوگا جنھیں سجع
و رعایتِ لفظی سے گراں بار کردیا گیا تھا اور جو زیادہ تر خوارق و کرامات کے تذکروں سے بھری ہوئی
تھیں اور جن میں سنہ و تاریخ، اساتذہ و شیوخ کی تفصیل، ممدوح کے علمی و عملی کارناموں کا تذکرہ
اور اسکے اصلی اوصاف و شمائل اور اخلاق و عادات کا ذکر برائے نام ہوتا ہے، اس دور کے
سیاسی و تمدنی حالات کا تذکرہ تو بڑی چیز ہے، ان میں بنیادی سوانحی معلومات کی بھی بڑی کمی ہے،
چنانچہ محقق سینکڑوں صفحات پڑھ جاتا ہے مگر اسکو حقیقی تاریخ کا ایک صفحہ بھی مشکل سے ہاتھ آتا ہے،
اور اس موضوع پر کام کرنے والا محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک تاریک سرنگ میں سے گذر رہا ہے،

جس میں ہوا و روشنی کا گذر نہیں، اس لیے ضروری تھا کہ تاریخ کے علاوہ ان کتابوں پر بھی نظر ڈالی جائے
جنکا اس موضوع سے براہ راست کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، مگر ان میں وہ چیزیں ملجاتی تھیں جو تراجم
وسیر کی براہ راست کتابوں میں نہیں ملتیں، اور کبھی ایسی گمشدہ کڑی بھی ہاتھ آجاتی ہے جسکے بغیر ایک
تذکرہ مکمل ہی نہیں ہوسکتا، اس کی بھی ضرورت تھی کہ مصنف محض کتابوں ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ ان
علماء کے متعلقین سے مراسلت بھی کرتے، گمنام کتب خانوں کا بھی جائزہ لیتے اور منتشر مخطوطات سے
بھی استفادہ کرتے، اپنے وسیع علمی ماحول اور ندوۃ العلماء کی نظامت کی وجہ سے ہندوستان کے
مختلف دینی وعلمی حلقوں سے مصنف کا رابطہ تھا، اس لیے ان چیزوں نے بھی ان کے کام میں
مدد دی، غالباً اس کتاب کی تالیف ان کی زندگی کی سب سے بڑی لذت تھی، اور ان کی زندگی کا
سب سے پُرمسرت اور خوشگوار وقت وہ ہوتا تھا جب وہ سب کاموں سے فارغ ہوکر اس
کام میں مشغول ہوتے تھے، اس لیے عمر بھر وہ اس کام کی طرف متوجہ رہے، اور کوئی سیاسی
ہنگامہ یا شخصی حوادث یا پیشۂ طبابت کی مصروفیت جو ان کا ذریعۂ معاش تھا، ان کے
سد راہ نہیں ہوئے، ندوۃ العلماء کی نظامت، اس کے سالانہ جلسے کا انتظام بھی اس کام
میں مخل نہیں ہوا، اور یہ کتاب آٹھ ضخیم جلدوں میں تیار ہوئی، اس میں ساڑھے چار ہزار
سے زائد شخصیتوں کے تراجم ہیں، ہندوستان ہی وہ واحد اسلامی ملک ہے جس کے مشاہیر
کی تاریخ قرن اول سے زمانۂ حال تک ایک ہی کتاب میں آگئی ہے، اسلیے کہ ایسے بہت سے اسلامی
ممالک ہیں جن کا اسلامی فکر و علوم میں شاندار حصہ رہا ہے، اور جہاں بے شمار علماء و مشاہیر
پیدا ہوئے، جیسے بخارا، سمرقند، افغانستان وغیرہ، لیکن ان کی کوئی علمی تاریخ یکجا نہیں
ملتی، اور اس تسلسل وتحقیق کے ساتھ ان شخصیات کا ذکر نہیں ہوا،

ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ کتاب مصنف کی شخصیت کا آئینہ بن گئی ہے، اور

اس میں اس کے قلب و روح کی تصویر اتر آئی ہے، صاف باطنی، بلا امتیاز مسلک خیال، جمال و کمال
سے تاثر اور اسکا اعتراف، مدح وتنقید میں اعتدال، کمزور پہلوؤں کی نشاندہی، طرز ادا کی
شیرینی، سبک روحی وغیرہ مصنف کے ذوق کے تنوع اور رنگا رنگی کا پورا عکس اس کتاب
میں آگیا ہے جس سے اس کی دلکشی اور دلکشائی میں اضافہ ہوگیا ہے، کتاب کا انداز ایسا
ہے کہ اس میں ہر صاحب ذوق کی تسکین کا کچھ نہ کچھ سامان موجود ہے، اس تنوع و رنگا رنگی
کی وجہ سے یہ کتاب ایک ایسا رفیق وانیس بن گئی ہے جس کی صحبت سے کسی وقت گرانی اور
ملال طبع پیدا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ وہ ذکر و موعظت اور درس وعبرت کا حسین و
دلآویز مرقع بھی ہے۔

پرانے مصنفین کی طرح مصنف بھی بڑی خاموشی کے ساتھ اس کام میں مشغول رہے
اور اس طویل اور پُرمشقت علمی سفر کے بارے میں زیادہ فکرمند بھی نہیں ہوئے حتی کہ اپنے
ان قریبی عزیزوں اور دوستوں کو بھی اس کی بھنک نہیں لگنے دی، جنکے ساتھ روزانہ کا
اٹھنا بیٹھنا تھا، کتاب کی اشاعت کے لیے انھوں نے نہ کسی ناشر کی تلاش کی اور نہ کسی
علمی مجلس یا ادارہ سے سلسلہ جنبانی کی، اسی اثنا میں وقت موعود آگیا اور انھوں نے
پندرہ جمادی الآخرہ ۱۳۴۱ھ (۲ فروری ۱۹۲۳ء) کو دنیا کو خیرباد کہا اور اپنے پیچھے
یہ عظیم ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے، جو تقریباً دس سال تک علمی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہا،
ظاہر ہے کہ یہ کام ایک اکیڈمی یا حکومت کا تھا جس کی سرپرستی ہی میں زیور طبع سے آراستہ
ہوکر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ سکتا تھا،

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ دائرۃ المعارف حیدرآباد نے جب علامہ حافظ ابن حجر عسقلانی
کی "الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنۃ" شائع کی تو اس کتاب کے بعض واقف کاروں نے

دائرہ کے ذمہ داروں کو مشورہ دیا کہ "الدرر" کی تکمیل کے لیے نزہۃ الخواطر کی دوسری جلد شائع کی جائے، جس میں آٹھویں صدی کے علمائے ہند کا تذکرہ ہے، اس طرح (۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء) میں یہ کتاب الدرر الکامنہ کے تکملہ کی حیثیت سے سامنے آئی، اور اس کی قیمت و افادیت نے اس کی اشاعت کے لیے راہ ہموار کی، اس کے لیے کسی کا منت کش نہیں ہونا پڑا، اور علمی دنیا اس مخفی خزانہ سے آشنا ہوئی، ساتھ ہی مستشرقین و محققین کا مطالبہ ہوا کہ مکمل کتاب چھپنی چاہیے، اس کی اشاعت میں مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی مساعی جمیلہ کا بہت بڑا حصہ ہے، جنھوں نے اشاعت کی تحریک کی اور ایک محضر تیار کر کے جس پر تقریباً ہندوستان کے چوٹی کے علما کے دستخط تھے، صدر اعظم حیدرآباد کی خدمت میں پیش کیا، اس کوشش سے کتاب کا پہلا حصہ ۱۳۶۶ھ (۱۹۴۷ء) میں منظر عام پر آگیا، یہ جناب ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب سابق ناظم دائرۃ المعارف کے دور کا واقعہ ہے، جس کے لیے موصوف اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں تیسرا حصہ شائع ہوا۔

اب ہندوستان کے حالات بدل چکے تھے، دولت آصفیہ کا جس کی سرپرستی میں ایسے بہت سے عظیم الشان علمی کام انجام پارہے تھے، خاتمہ ہو چکا تھا، اس لیے دوسرے کاموں کے ساتھ یہ سلسلہ بھی رک گیا، اور بظاہر اس کی امید نہیں باقی رہی کہ کتاب کی بقیہ جلدیں جو زیادہ ضخیم تھیں شائع ہو سکیں گی لیکن ان کی طباعت کا اس طرح غیب سے سامان ہو گیا کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کو اپنے کچھ خاندانی بزرگوں کے حالات کی تلاش تھی، جو کہیں دستیاب نہیں ہوتے تھے، لکھنؤ کے ایک سفر میں مولانا نے اس کتاب کا مطالعہ فرمایا، اور ان میں سے اکثر کے حالات اس کی غیر مطبوعہ جلدوں میں مل گئے، مولانا نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اور خود مولانا ابوالکلام آزاد سے جن کی وزارت تعلیم سے دائرۃ المعارف کا خصوصی

تعلق تھا، اس سلسلہ کی تکمیل کی تحریک کی، مولانا آزاد، مصنف مرحوم اور اس کتاب سے ذاتی طور پر واقف تھے، انھوں نے اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اعتراف کیا اور اس کا وعدہ فرمایا کہ وہ دائرہ کو اس کی طرف متوجہ کریں گے، چنانچہ ان کی تحریک سے کتاب کی بقیہ جلدوں کی طباعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا، اور ۱۹۵۴ء میں اس کا چوتھا حصہ شائع ہوا، پھر یکے بعد دیگرے اس کے دوسرے حصے شائع ہوتے رہے، یہاں تک کہ ۱۹۵۹ء میں اس کا ساتواں حصہ شائع ہوا، اب صرف اس کی آٹھویں جلد باقی تھی، مگر یہ حصہ تکمیل و اضافہ کے بغیر اشاعت کے قابل نہ تھا، اور یہ کام بڑی محنت، عرق ریزی اور تحقیق و جستجو کا طالب تھا، اس لیے متواتر کئی سال گذر گئے اور اس کو ہاتھ نہ لگایا جا سکا۔

یہ آٹھویں جلد ۵۵۹ تراجم پر مشتمل تھی اور مصنف کے لکھے ہوئے ناتمام تراجم کی تعداد تین سو پچاس ۳۵۰ تھی، ان میں سے بہت سے اصحاب تراجم مصنف کے معاصر اور عمر میں ان سے چھوٹے تھے، لیکن بعد میں انھوں نے علمی اور تصنیفی شہرت حاصل کی اور مختلف تحریکات کی سربراہی اور قیادت تک پہنچے، اس لیے ان کے ان حوادث زندگی اور علمی و سیاسی کارناموں کا تذکرہ ضروری تھا، جو بعد میں ظاہر ہوئے، ادھر کچھ عرصہ سے ہند و بیرون ہند کے شائقین اور قدر دانوں کا اصرار بڑھتا جارہا تھا، خصوصاً میرے فاضل دوست ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں صاحب حال ناظم دائرۃ المعارف نے کئی بار اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی، میرے لیے یہ کام خود بڑی دلچسپی کا تھا کیونکہ یہ علمی و دینی خدمت کے ساتھ ملکی و ملی خدمت بھی تھی، اور سب سے بڑھکر یہ کہ والد مرحوم کے حق کی ادائیگی اور اپنی سعادت مندی کا ثبوت بھی تھا، اس کے باوجود چند سال تک اس اہم کام کے لیے اپنے کو آمادہ نہیں کر سکا، اولاً یہ کام میری قوت و صلاحیت سے فزوں تر تھا، اس کتاب کی خالی جگہوں کی تکمیل، نئے اضافوں اور نئی عبارتوں کی پیوندکاری

بہت مشکل کام تھا، دشواری کی ایک خاص وجہ مصنف کا ایجاز و اختصار، انکا ناقابل تقلید اور گٹھا ہوا طرز تحریر[1]، خیالات اور مدح و نقد کا اعتدال تھا جس کا التزام ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا

دوسری شکل یہ بھی کہ اس جلد کے تراجم میں پہلی جلدوں کے مقابلہ میں وسعت اور تنوع زیادہ تھا، کیونکہ اس میں اکابر علماء، ممتاز مصنفین، قابل احترام بزرگ اور اہل دل، مشہور ماہرین درس و تعلیم، جدید ہندوستان کے مفکرین اور جدید تحریکات کے قائد و راہنما، اپنی معرکہ آراء شخصیتوں کے ساتھ زیر بحث ہیں، جن کے متعلق کوئی ذمہ دارانہ تحریر علمی حلقوں میں موضوع بحث بن سکتی ہے، ان میں ادبا و شعراء کے ماسوا بہت سے ایسے سیاسی قائدین زیر بحث تھے، جنکی سوانح ہندوستان کی دینی اور سیاسی تاریخ کا ایک جزء لاینفک ہے، اور ان کی زندگی بڑے نازک ادوار سے گذری ہے، ان میں بعض ایسی ہستیاں بھی تھیں جو اپنے فضائل و کمالات کے لحاظ سے عبقری (جینیس) کہی جا سکتی ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو مسلمانوں کے سواد اعظم سے کٹ گئے، اور کسی نئے مذہب اور فرقہ کے بانی ہوئے، اس لیے سخت تنقید و مخالفت کا نشانہ بنے۔ اس طرح یہ کتاب حیات و فکر انسانی کا رنگا رنگ مرقع بن گئی ہے۔

معاصرین کی سوانح نگاری علمی دنیا کا سب سے مشکل کام ہے، اس لیے کہ مصنف اپنے امکان بھر اپنے مشاہدات و تاثرات لکھنے اور اپنے معاصر کی تصویر کشی کی پوری کوشش کرتا ہے، لیکن اسکے عقیدت مند اسے کم سمجھتے ہیں اور بعد والے اس کو مبالغہ آرائی پر محمول کرتے ہیں، اس طرح

[1] یہ کتاب سلیس و فصیح طرز تحریر کا دلکش نمونہ ہے، اس عصر کے امام عربیت علامہ ڈاکٹر شیخ تقی الدین الہلالی المراکشی اس کے بڑے مداح ہیں، انھوں نے ایک بار فرمایا کہ میں نے ایسی سلیس و رواں عربی لکھنے والے اپنی عمر میں دو ہی دیکھے ہیں، ایک اس کتاب کے مصنف، دوسرے مغرب اقصی کے ایک عالم جن کو مقری کی ضخیم کتاب "نفح الطیب" زبانی یاد تھی، افسوس ہے کہ مجھے ان عالم کا نام یاد نہیں رہا۔ (ابو الحسن علی)

مصنف فریقین کی تنقید کا نشانہ بنجاتا ہے، کبھی اسے کوتاہی اور حق تلفی کا الزام دیا جاتا ہے اور کبھی مبالغہ اور قصیدہ خوانی کا مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، لیکن کسی طالب حق اور حقیقت نگار مصنف کو یہ چیز روک نہیں سکتی ہیں، وہ آیندہ نسلوں کے لیے اپنی معلومات بہر حال فراہم کرکے رہتا ہے، اور حقیقی تاریخ کے خد و خال اپنی نقش آرائیوں سے واضح کر دیتا ہے، میں نے ڈرتے اور جھجکتے ہوئے یہ کام شروع کیا تھا، لیکن انشراح اور لطف کے ساتھ اسے ختم کیا، اس کتاب میں میرا طریقہ یہ تھا کہ اصحاب تراجم کے حالات میں مصنف کے بعد جو تغیر اور اضافہ ہوا تھا، اسے قریب ترین اور قابل اعتماد ماخذوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی، اور اصحاب تراجم کی ذاتی تصنیفات اور رفیقوں کے بیانات سے اس کی تکمیل کی، یا پھر اپنے مشاہدات اور ذاتی علم سے مدد لی،

اس سلسلہ میں اس کا التزام رکھا ہے کہ میری ناقص تحریروں اور مصنف کی اصل عبارت میں امتیاز قائم رہے، اس لیے متن کتاب میں جو اضافہ بھی ہوا ہے، اس کو عمودین [ ] میں کر دیا ہے، تاکہ اصل اور اضافہ میں التباس نہ ہو، اس کی خاص طور سے کوشش کی گئی ہے کہ مصنف کی تحریر کا انداز اور شخصیات پر رائے زنی میں ان کا معیار امکانی حد تک قائم رہے، اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے ادب و اسلوب اور طرز فکر کو اپنایا جائے اور اس کی تقلید کی امکانی کوشش کی جائے، راقم سطور نے اس کتاب کو بار بار پڑھا اور اپنے کو اس سے ہم آہنگ کیا ہے لیکن اس کا اعتراف ہے کہ وہ بھی مصنف کے نقطۂ اعتدال تک نہیں پہنچ سکا، اور ان کی خداداد دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی بھی شاید قابو میں نہیں آسکی۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میرے اضافے مصنف کے قائم کردہ تراجم ہی تک محدود ہیں، میں نے اپنی طرف سے کوئی نیا عنوان نہیں بڑھایا ہے، اس لیے کہ یہ کام بہت طول پکڑ جاتا، مصنف کے بعد کی شخصیات جو کسی خاص امتیاز کی مالک ہوئیں سینکڑوں ہیں

جو "نزہۃ الخواطر" کے کسی مستقل تکملہ (ذیل) میں آسکتی ہیں، اکثر اصحاب تراجم کے سنین وفات مطبوعہ کتابوں میں نہیں مل سکے، اس کے لیے ان کے متعلقین اور واقفین سے طویل مراسلت کرنی پڑی، بعض دفعہ تاریخوں کے لیے زیارتِ قبور اور کتبہ خوانی کی بھی نوبت آئی اور کبھی ولدیت وغیرہ کی تحقیق کے لیے میونسپل بورڈ کے کاغذات سے بھی مدد لینی پڑی، اس طرح وفیات ومعلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم ہوگیا، پھر بھی سَو سے زائد افراد ایسے رہ گئے جنکے سنین وفات حاصل نہیں ہوسکے، ان کا حاشیہ میں ذکر کردیا گیا ہے، اندازہ ہے کہ اگر چند سال اور یہ معلومات حاصل نہ کیجاتیں۔ تو بعد کے سوانح نگاروں کو خاصی دشواری پیش آتی، اس کام میں جو آسانیاں حاصل ہوئیں، اس کی توجیہ مصنف مرحوم کے اخلاص اور اس کتاب کی قبولیت کے سوا کسی اور چیز سے نہیں کی جاسکتی، یا پھر یہ علم و دین کے ان وفاداروں کی مقبولیت کا کرشمہ ہے جن کے حالات اس کتاب میں ہیں،

ان اہل علم اور کرم فرماؤں کی فہرست خاصی طویل ہے جنھوں نے بعض جزوی معلومات اور سنین وفات کے سلسلہ میں تکملہ نگار کی مدد فرمائی، راقم ان سب حضرات کا صمیم قلب سے شکر گذار ہے، یہاں پر صرف ان محسنین کا نام درج کیا جاتا ہے جنھوں نے بار بار زحمت فرمائی اور جن سے متعدد تراجم میں بیش قیمت مدد ملی، مثلاً حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (سہارنپور)، مولانا حکیم عبدالخبیر صاحب صادقپوری (پٹنہ)، مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی (رامپور)، مولانا نسیم احمد صاحب فریدی (امروہہ)، مولانا محمد عمران خان صاحب ٹونک (راجستھان)، مولانا شاہ عون احمد صاحب (پھلواری شریف)، مولانا محمد رضا صاحب انصاری (فرنگی محل لکھنؤ)، مولانا محبوب الرحمن صاحب ازہری (مدرسہ عالیہ کلکتہ)، ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی (دہلی یونیورسٹی)، مولوی سید محبوب رضوی صاحب (دیوبند)، مفتی وحید الحسینی صاحب (بھوپال)، مولانا عبدالستار خان صاحب ایم اے

(جامعہ عثمانیہ حیدرآباد)، مولانا ابو الوفا صاحب افغانی (حیدرآباد)، مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی (مئو)، مولانا سید علی نقی صاحب مجتہد (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) مولانا ابو سعید صاحب مجددی (رامپور)، مولوی عبید الرحمن خاں صاحب شیروانی (علی گڑھ)، مولانا صبغۃ اللہ صاحب بختیاری (مدراس)، مولوی عبدالرحمن صاحب کشمیری سابق ایم، بی قاضی رفیع الدین صاحب (سندیلہ) اور مولانا شاہ مصطفےٰ حیدر صاحب (کاکوری) اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اس بیش قیمت اعانت پر جزائے خیر عطا فرمائے۔

آج کتاب کی آٹھویں جلد پر یہ سلسلہ تمام ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پہلی جلدوں کی طرح مقبول کرے۔ الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصالحات

میر حسین شاہ حقیقت

(حالات اور تصنیفات)

از

جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب

حقیقت کے نام کے متعلق مختلف بیانات ملتے ہیں، مصحفی نے حقیقت کا نام میر شاہ حسین لکھا ہے، (تذکرہ ہندی ص ۸۶)، بعد کے تذکرہ نگاروں میں قدرت اللہ قاسم، عبد الغفور خاں نساخ، شیفتہ اور سید علی حسن خاں وغیرہ نے بھی شاہ حسین تحریر کیا ہے، ان کی تصنیفات مثنوی ہشت گلزار و ہیرامن طوطا میں ان کا نام شاہ حسین ہی ملتا ہے، ان کے لڑکے میر محسن علی محسن نے سراپا سخن میں ان کا نام کہیں سید حسین شاہ اور کہیں سید شاہ حسین لکھا ہے، ان تحریروں کے برخلاف ان کی تصنیفات صنم کدۂ چین، خزینۃ الامثال اور تحفۃ العجم میں انکا نام سید حسین شاہ تحریر ہے، ان کے بڑے بھائی سید حسن شاہ کی کتاب نشتر (۱۲۰۵ھ) میں سید حسین شاہ نام ملتا ہے (ص ۳)، خود حقیقت نے اپنا نام میر حسین شاہ لیا ہے ؎

پھرتا ہے جو یوں تباہ کیا تجھکو ہوا ہے کس سے جدا تو آہ کیا تجھکو ہوا
جو دیکھے ہے تیری شکل رو دیتا ہے اے میر حسین شاہ کیا تجھکو ہوا

(قومی زبان کراچی ص ۱۴، فروری ۱۹۶۳ء)

حقیقت کے دادا کا نام میرک شاہ، والد کا نام عرب شاہ، تایا اور چچا کا نام سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ اور سید محمد میر شاہ تھا۔ ان کے بڑے بھائی کا نام سید حسن شاہ اور چھوٹے بھائی کا نام سید قاسم شاہ تھا، اس نہج پر حقیقت کا صحیح نام سید حسین شاہ تھا جس کی تصدیق ان کی مذکورہ تین تصنیفات اور رباعی سے ہو جاتی ہے۔

حقیقت حضرت سید عبد اللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں تھے، "جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سبط رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتا ہے" (نشتر ص ۱) حقیقت کے نانا "حکیم میر محمد نواز حضرت سید عکا موسوی کی اولاد میں ہیں" (نشتر ص ۳)

حقیقت کے جدی وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، مصحفی نے لکھا "وطن اجدادش بلخ و خوست است"۔ قدرت اللہ قاسم، شیفتہ اور سید علی حسن خاں نے بتایا ہے کہ ان کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے، محسن علی نے لکھا ہے کہ ان کے بزرگوں نے "علبستان" سے آکر خوست میں توطن اختیار کیا تھا، سریرام نے ان کے بزرگوں کا وطن خوست توابع بلاد غور بتایا۔ اس سلسلے میں حقیقت کے بڑے بھائی سید حسن شاہ کا بیان قابل ترجیح ہے، وہ لکھتے ہیں " اپنے والد (یعنی حضرت سید عبد اللہ کے والد) حضرت ابراہیم رضا کے سامنے خلفائے بنو عباس کے جور و جفا سے حدود مدین میں مخفی سکونت پذیر تھے، شدت ظلم اعدا کی وجہ سے مع تبرکات شریفہ نسلاً بعد نسلٍ چلے آتے تھے، بعد شہادت والد بزرگوار مع چند ہمراہیان حدود ترکستان میں پہنچے، اور اقامت اختیار کی، ان کی اولاد سے جناب سید السادات قطب انام سید امیر کلال عرف امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ کا شہرہ عام ہوا، حتی کہ صاحب قران امیر تیمور گورگاں کو

آپ نے اپنا پسر خواندہ فرمایا اور بشارت سلطنت ہفت کشور کی دی جس کا حال آپ کے ملفوظات میں بالتفصیل درج ہے، اور اس پیشین گوئی کا ظہور خاندان تیموریہ میں صدہا برس تک رہا، بعد انتقال سید السادات کے آپ کے صاحبزادہ امیر برہان مشہور بہ امیر بزرگ حسب استدعا صاحب قراں چندے اس کے پاس رہ کے وطن تشریف لے گئے، ان کے صاحبزادے سید امیر شاہ نے اپنی جاگیر عطیہ صاحب قراں قصبہ شریعت آباد حدود خوست منمضافات بدخشاں میں اقامت اختیار کی اور حسب رواج خاندان ارشاد خلائق میں مصروف رہے" (نشتر ص ۱، ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقتؔ کے جد امجد یمن سے ترکستان وارد ہوئے اور ترکستان سے قصبہ شریعت آباد حدود خوست منمضافات بدخشاں میں آکر توطن اختیار کیا۔ اب رہا بلخ کا سوال تو حقیقتؔ کے پرنانا سید شاہ نیاز بلخ کے رہنے والے تھے، جیسا کہ سید حسن شاہ نے تحریر کیا ہے "آپ کے والد (یعنی میر محمد نواز کے والد) سید شاہ نیاز محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں بلخ سے شاہ جہاں آباد کو تشریف لائے اور منصب داران میں شامل ہوئے" (ایضاً ص ۳)

اب یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ حقیقتؔ کے ددھیالی بزرگوں کا تعلق خوست سے تھا، اور ان کے ننھیالی بزرگوں کا بلخ سے، بعض تذکرہ نگاروں کا یہ لکھنا کہ حقیقتؔ کے اجداد کا وطن بلخ تھا محض غلط ہے۔ اگر ان کے ددھیالی اور ننھیالی اجداد کو سامنے رکھکر یہ کہا جائے کہ "وطنِ اجدادش بلخ و خوست است" تو یہ بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

حقیقتؔ کے بزرگوں کے ورودِ ہندوستان کے متعلق دو بیانات ملتے ہیں، صنم کدۂ چین میں مرقوم ہے کہ ان کے بزرگ اول عرب سے شاہ جہاں آباد آئے (ص ۳۲)، محسن علی نے لکھا ہے کہ سید امیر کلال کی اولاد میں سے سید امیر برہان حسب الطلب فرخ سیر مع تحائف خانقاہی لاہور پہنچے، اور وہاں سے حقیقتؔ کے دادا سید میرک شاہ بعہد شاہ عالم دلی آئے، اس

سلسلے میں سید حسن شاہ نے لکھا ہے "تاآنکہ نوبت سجادگی حضرت حاجی الحرمین سید میرک شاہ رحمۃ اللہ علیہ جد بزرگوار کاتب الحروف کو پہنچی اور بموجب بشارت ارواحِ طیبات بزرگاں مع چند تبرکات شریفہ عازم ہندوستان ہوئے، ۱۱۲۵ھ میں بیس۲۰ قرابت دار اُن کے ساتھ داخلِ کابل ہوئے، صوبہ دار کابل کی استدعا سے چند مہینے اقامت کر کے بقصد شاہ جہان آباد وارد لاہور ہوئے اور بوجہ اصرار عقیدتمندانِ شاہ جہاں آباد کا قصد ملتوی فرمایا، صرف ایک شخص مسمی سید گدا شاہ اپنے ہمراہی کو فرخ سیر بادشاہِ ہندوستان کے پاس روانہ کیا۔ مگر ساداتِ بارہہ کے تسلط اور غلو سے ملاقات نہ ہو سکی، سید موصوف کی معاودت بادشاہ کا بعد ملنے کے مطلع ہونا عذر خواہی کے ساتھ نذر و نیاز کا اپنے خواص خاص کے ساتھ جناب حاجی صاحب کی خدمت میں بھیجنا اور متمنی تشریف آوری حضرت موصوف ہونا بموجب بشارت روح بزرگان جناب سید حقانیؒ متوطن قصبہ بندگی متعلقہ چکلہ کوڑہ جہاں آباد کی صاحبزادی سے نکاح کیا، اور صرف ایک بار محمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں شاہ جہاں آباد کو تشریف لے گئے، ورنہ ہمیشہ اطراف لاہور اور سرہند میں بسر فرمائی، اور ایک عالم کو فیوض باطنی سے سرفراز فرمایا" (نشتر ص ۲)

اس تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتؔ کے دادا سید میرک شاہ نے ۱۱۲۵ھ مطابق ۱۷۱۳ء میں خوست سے سفر اختیار کیا اور وہ بعہد فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) براہ کابل وارد لاہور ہوئے، وہ ہمیشہ اطراف لاہور اور سرہند میں رہے، اور صرف ایک بار محمد شاہ کے عہدِ حکومت (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) میں شاہ جہاں آباد گئے، اس لیے وہ عبارت جو صنم کدۂ چین میں ملتی ہے اور وہ اطلاع جو محسن علی نے دی ہے

سید حسن شاہ کے بیان کے مطابق غلط ہیں۔

صنم کدۂ چین میں ہے کہ حقیقت کے اجداد کٹھیر میں متوطن ہوئے (ص ۳۲)، کٹھیر کی حدود روہیلکھنڈ کی حدود موجودہ حال کو شامل تھیں" (اخبار الصنادید ص ۵۰) گویا حقیقت کے اجداد روہیلکھنڈ وارد ہوئے۔ مصحفی نے لکھا ہے: "وطن اجدادش بلخ وخوست است وخود در بریلی تولد یافتہ۔" (تذکرۂ ہندی ص ۸۶)۔ حقیقت کے بزرگوں کی بریلی میں آمد اور حقیقت کی بریلی میں پیدائش کے متعلق ضروری معلومات سید حسن شاہ سے ہی ملتی ہیں، انھوں نے نشتر میں لکھا ہے "حاجی صاحب موصوف (یعنی سید میرک شاہ) کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، سید محمد شاہ، سید اشرف شاہ، سید عرب شاہ والد مصنف، سید محمد میر شاہ، مگر ان چوتھے صاحبزادے نے مناصب شاہی اختیار کر لیے، اور نفع کثیر خلق اللہ کو پہنچایا، بالجملہ بعد انتقال حاجی صاحب (یعنی سید میرک شاہ) اور دست برد نادر شاہ اصفہانی و احمد شاہ درانی اور تغیر سلطنت گورگانی نواب نجیب خاں چچا صاحب کو اپنے ہمراہ شاہ جہاں آباد میں لایا اور عموی موصوف نے بعد چندے نجیب آباد اور نگینہ دھام پور میں اقامت اختیار کی اور وہیں انتقال فرمایا، میرے والد ماجد (یعنی سید عرب شاہ) سکھوں کی زبردستیوں سے تنگ ہو کر آنولہ بریلی میں تشریف لائے اور وہیں شادی بھی کی، چنانچہ ۱۱۸۴ھ میں میری ولادت ہوئی اور دو چھوٹے بھائی بھی اسی شہر میں پیدا ہوئے، ۱۱۹۴ھ میں جناب والد مغفور نے انتقال فرمایا، اور دونوں چھوٹے بھائی سید حسین شاہ و سید قاسم شاہ سلمہما اللہ تعالیٰ جناب نانا صاحب قبلہ کے زیر تربیت و تعلیم اسی شہر میں رہے اور جو کچھ پڑھا لکھا

ان ہی کی مزید شفقت کا نتیجہ ہے۔" (ص ۳)، اس کے بعد وہ اپنے نانا حکیم میر محمد نواز کی بریلی میں آمد کے متعلق لکھتے ہیں: "میرے نانا صاحب قبلہ حکیم میر محمد نواز حضرت سید عرب کاموسوی کی اولاد میں ہیں، اور علم و فضل خصوصاً طب و حکمت میں یگانۂ وقت و فرید دہر کہنا چاہیے، آپ کے والد سید شاہ نیاز محمد شاہ بادشاہ کے وقت میں بلخ سے شاہ جہاں آباد کو تشریف لائے۔ اور منصب داران شاہی میں شامل ہوئے، وہیں شادی بھی کی، ۱۱۸۴ھ میں جب کہ والد مرحوم کی شادی ہوئی اس وقت حکیم صاحب موصوف نواب عنایت اللہ خاں پسر حافظ الملک حافظ رحمت خان کی سرکار میں ملازم با امتیاز تھے، اور شہر بریلی میں اقامت گزیں بعد خرابی تباہی حکومت ہندوستان میرے نانا صاحب مسٹر منگ صاحب ممبر کونسل کیمپ کانپور کی سرکار میں جو ہمشیرہ زادہ جنرل کوٹ کے تھے اور یہ جنرل صاحب ایک عالی مرتبت انگریز تھے، عہدۂ منشی گری پر مامور ہوئے۔" (ص ۳)

ان سطور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کے نانا بریلی میں پہلے سے موجود تھے اور وہ نواب عنایت خاں (المتوفی ۱۷۷۳ء) پسر نواب حافظ رحمت کی سرکار میں ملازم تھے، نواح لاہور اور سرہند میں سکھوں کی زبردستیوں سے تنگ آکر حقیقت کے والد آنولہ (بریلی) وارد ہوئے، یہ زمانہ ۱۷۶۱ء کے بعد کا ہے، کیونکہ اس سنہ میں ابدالی اور مرہٹوں کے درمیان لڑائی ہوئی تھی، اور دہلی کو جائے امن نہ پاکر لوگ پورب کی سمت سفر کر رہے تھے. اس وقت بریلی میں روہیلوں کا اقتدار تھا، اور باہر کے آئے ہوئے لوگوں کی پرورش ہو رہی تھی، نواب نجیب الدولہ (المتوفی ۱۷۷۰ء) امیر الامرا اور شاہ عالم (مدت جلوس

۱۷۵۹ء تا ۱۸۰۶ء) سریرآرائے سلطنتِ مغلیہ تھے، حقیقت کے چچا مسمی سید
محمد میر شاہ نے نجیب الدولہ کی رفاقت قبول کی اور وہ نگینہ دھام پور میں مقیم
ہوگئے، جہاں ان کا انتقال بھی ہوا، سید عوب شاہ نے ۱۱۸۴ھ مطابق ۱۷۷۰ء
میں حکیم میر محمد نواز کی لڑکی سے عقد کیا اور اس کے بطن سے ۱۷۷۱ء میں سید
حسن شاہ پیدا ہوئے، سید حسن شاہ کے دو چھوٹے بھائی یعنی سید حسین شاہ
اور سید قاسم شاہ بھی آنولہ (بریلی) میں پیدا ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ سید حسین شاہ
حقیقت ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں پیدا ہوئے، سید عوب شاہ کے انتقال
کے بعد (۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء) حقیقت اور ان کے چھوٹے بھائی اپنے
نانا کے زیر تربیت آگئے، انھوں نے جو کچھ پڑھا لکھا وہ ان کے نانا کی شفقت کا نتیجہ تھا،
۲۳ر اپریل ۱۷۷۴ء کو شجاع الدولہ اور کمپنی کی مشترکہ افواج کے مقابلے
میں نواب حافظ رحمت خاں کو شکست ہوئی تو بریلی پر تباہی آئی اور لوگوں نے
مختلف اطراف میں سفر شروع کیا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم میر محمد نواز نے اپنے
داماد سید عوب شاہ کی وفات (۱۷۸۰ء) کے چند سال بعد بریلی سے سفر کیا،
وہ بریلی سے کانپور پہنچے، اور منگ صاحب کی سرکار میں عہدۂ منشی گیری پر مامور
ہوئے، حکیم میر محمد نواز کے کہنے پر سید حسین شاہ کو منگ صاحب نے اپنے خانگی
روپے پیسے کے حساب وکتاب کے لیے ملازم رکھ لیا، سید حسن شاہ نے لکھا ہے کہ
اس وقت ان کی عمر پندرہ سولہ برس کی تھی (ص ۵)، اس طرح حکیم میر محمد نواز
اور سید حسین شاہ ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں کانپور میں تھے، فکر معاش سے آزاد
ہونے کے بعد حکیم میر محمد نواز نے بریلی سے متعلقین کو بلوا کے قصبہ جاج مئو (کانپور)

میں سکونت اختیار کر لی تھی، اس سلسلے میں سید حسن شاہ نے نشتر میں لکھا ہے "صاحب نے
نانا صاحب سے ذکر کیا کہ مجھے بوجہ عدیم الفرصتی اپنا خانگی کاروبار حساب وکتاب دیکھنے
کی مہلت نہیں ملتی اور اکثر میرا روپیہ مفت تلف ہوتا ہے، اگر آپ اس کام کو بوجہ اسکے
کہ بالفعل کوئی دوسرا کام آپ کے ذمے نہیں ہے دیکھ بھال کریں تو بہتر ہے، نانا صاحب
نے انکار کیا اور کہا کہ اگر حسن شاہ اس کام کو قبول کرے گا تو آپ کی غایت پوری
ہو سکتی ہے، چنانچہ منگ صاحب نے مجھکو بلوا کے اصرار کیا اور میں نے بعد چند
شروط کے اس کو قبول کر لیا (ص ۳-۴)

"میری عمر اس زمانے میں پندرہ سولہ برس کی تھی، اور نانا صاحب نے بریلی سے
متعلقین کو بلوا کے قصبہ جاج مئو میں جو کانپور سے دو کوس پورب کی طرف ہے سکونت
کر لی تھی، اور چونکہ کوئی تعلق خدمت باقی نہ رہا تھا، اکثر خانہ نشین رہتے تھے، میں اور
چھوٹا بھائی میر حسین شاہ اور چچازاد بھائی میر محمد یوسف شاہ مع بعض قرابتداروں
کے کیمپ میں رہتے تھے۔" (ص ۵)

حقیقت کانپور سے لکھنؤ پہنچے، مصحفی نے لکھا ہے "بہ لکھنؤ بہ سن تمیز رسیدہ" (تذکرہ
ہندی ص ۸۶) حقیقت ۱۲۰۰ھ مطابق ۱۷۸۵ء میں کانپور میں تھے، اس وقت
ان کی عمر تیرہ سال کی تھی، مصحفی نے تذکرہ ہندی ۱۲۰۱ھ مطابق ۱۷۸۶ء سے
قبل لکھنا شروع کیا تھا، سردست اگر یہ مان لیا جائے کہ انھوں نے حقیقت کا حال
۱۲۰۱ھ یا اس کے دو ایک سال کے بعد قلمبند کیا تو حقیقت چودہ پندرہ سال کی
عمر میں لکھنؤ پہنچے، وہاں وہ جرأت کے ادبی حلقے میں داخل ہوئے اور شاعری میں
ان کا تلمذ اختیار کیا، شاید جرأت سے تلمذ کا باعث یہ امر تھا سید حسن شاہ ضبط

جرأت کی شاگردی اختیار کر چکے تھے، مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں لکھا ہے کہ حقیقت ابتدا میں جرأت کی غزلوں کی کتابت کیا کرتے تھے، کیونکہ وہ بوجہ کور چشمی لکھنے پڑھنے سے معذور تھے (ص ۸۶)۔ جب وہ جوان ہوئے تو فکر معاش دامنگیر ہوئی، وہ پہلے ترک سواروں میں ملازم ہوئے (تذکرۂ ہندی ص ۸۶)، قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ وہ معلمی کر کے اوقات بسر کرتے تھے، خود ان کی رباعی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سبزی منڈی (لکھنؤ) میں کسی خدمت پر مامور تھے، ؎

کس منہ سے ادائے شکر ہم حق کا کریں ۔۔۔ بندہ پرور نہ کیوں کہ پھر اسکو کہیں

یعنی ہم تھے جو عاشق سبز رنگ ۔۔۔ خدمت بھی ملی تو سبزی منڈی کی ہمیں

(قومی زبان کراچی، ص ۱۵، یکم فروری ۱۹۶۳ء)

مصحفی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک سواروں کا رسالہ برہم ہونے کے بعد حقیقت کی ملازمت بھی ختم ہوگئی، اس وقت امام بخش خاں کشمیری کو جو پڑھا لکھا نہیں تھا، ایک تذکرۂ شعرا لکھنے کا خیال پیدا ہوا، اور اس کو ایک ایسے شخص کی ضرورت ہوئی جو بچوں کی معلمی کے ساتھ اس کا تذکرہ بھی لکھتا رہے، چنانچہ جرأت کی سفارش پر حقیقت، امام بخش خاں کشمیری کے منشی مقرر ہو گئے، مصحفی کے پاس ان کا اپنا خام مسودہ تذکرۂ شعرا موجود تھا، جس کو امام بخش خاں کشمیری بالحاح تمام لے گیا اور اس سے شعرائے دہلی کے حالات و اشعار نقل کرائے، جب مصحفی نے اپنے ایک ملنے والے کے ذریعے امام بخش خاں کشمیری کے تذکرے کا جزو اول دیکھا اور اس میں اپنے تذکرے کے مطابق آفتاب و آصف تخلص پایا تو وہ "اصحاب ثلاثہ" پر برہم ہوئے اور قریب تھا کہ ان کی ہجو لکھتے، مگر جب انھوں نے امام بخش خاں کشمیری کے جریدے میں

پوچ عبارت اور غلط احوال و اشعار کو دیکھا تو درگزر کو قرین مصلحت اور نظامی کا ایک شعر اور اپنا ایک قطعہ لکھنا کافی سمجھا ؎

اگر بر فروزی چو مہ صد چراغ ۔۔۔ ز خورشید باشد بر و نام داغ

قطعہ

جانتے ہیں سب کہ ایک مدت سے یہاں ۔۔۔ مصحفی کے تذکرہ کا شور ہے

تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا ۔۔۔ بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

(تذکرۂ ہندی ص ۸۶، ۸۷)

اس معاملے میں امام بخش خاں کشمیری ہی ملزم تھا، جرأت اس واقعے سے غیر متعلق ہیں، حقیقت کی حیثیت ایک منشی کی ہے۔ اصل میں مصحفی کا دل جرأت کی طرف سے صاف نہیں تھا ــــ "کور حوصلی کہ بہمسری من میرود در باطن ہمیشہ تخم کینہ می کارد" (تذکرہ ہندی ص ۸۶)۔ وہ جرأت اور امام بخش خاں کشمیری کا تو کچھ بگاڑ نہ سکے، حقیقت پر برس پڑے۔

حقیقت تعلیم و تربیت کی اعلیٰ روایات کے حامل تھے، ان پر سرقے کا الزام بے بنیاد ہے، اس وقت ان کی عمر چودہ پندرہ برس کی تھی، یہ عمر کم سے کم تذکرۂ شعراء مرتب کرنے کی نہیں ہوتی، ان کی سب سے پہلی کتاب صنم کدۂ چین سنہ ۱۲۰۹ھ مطابق سنہ ۱۷۹۴ء میں ضبط تحریر میں آئی، جب کہ ان کی عمر بائیس ۲۲ برس کی تھی، امام بخش خاں کشمیری سے بھی ایک تذکرۂ شعرا مسمی تذکرۂ امام بخش کشمیری منسوب ہے، جو نزاعی تذکرہ ہو سکتا ہے، اس لیے یہ رائے بھی کہ حقیقت کا "تذکرۂ احبا" مصحفی کے خام مسودہ سے تیار کیا گیا اور جس کی بنیاد پر مصحفی نے حقیقت کو چور کہا، صحیح نہیں معلوم ہوتی،

حقیقت کو لکھنؤ میں مالی فراغت میسر نہیں ہوئی، وہ سفر پر مجبور ہوئے اور کلکتہ چلے گئے، جہاں منشی گری پر ملازم ہوگئے۔ (صنم کدۂ چین ص ۳۲) سعادت خاں ناصر نگینوی صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبا کے بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ وہ ریزیڈنٹ کے دفتر کلکتہ میں میر منشی مقرر ہوئے،

(سہ ماہی صحیفہ لاہور ص ۲۶ جنوری ۱۹۶۸ء)

حقیقت ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں کرناٹک میں تھے، اس وقت تک وہ بہت پریشان تھے، اور انھوں نے تلاش معاش کی خاطر متعدد سفر کیے تھے، انھوں نے اپنی پریشانیوں کا اظہار مثنوی ہشت گلزار (۱۲۲۵ھ) میں کیا ہے:-

یعنی میں مبتلائے درد و الم — چھوڑ اپنے وطن کو اے ہمدم
دشت پیما ہوا اور کوہ نورد — دیکھی دنیا کی خوب گرم و سرد
پورب آیا کبھی گیا پچھم — نہ گیا لیک دل کا درد و غم
گاہ اُتر پھرا گہے دکھن — پر کرم کے گئے نہ بد پچھن
دیکھا پھر آکے ملک کرناٹک — کہتے دکھن کا ہیں جسے پھاٹک
گرچہ سب کچھ وہاں مہیا ہے — سیم کا اور نہ زر کا توڑا ہے
ایک شب گفتگو دل سے تھی — لائی قسمت مجھے کہاں میری
یاں کسی سے نہیں شناسائی — یاں نہیں کوئی غیر تنہائی
کیا کروں جاؤں کس طرف کو نکل — دل کو بہلاؤں میں کہاں بیکل
گھر سے جانا کہیں نہ آنا ہے — خانہ کیا ہے کہ قید خانہ ہے

کب تلک کوہ اور بن دیکھوں — جلد پھر جاکے میں وطن دیکھوں

(ص ۴)

انھیں کرناٹک میں نواب عبدالقادر خاں ثابت جنگ ابن نواب والاجاہ مرحوم والیِ کرناٹک کی خدمت میں باریابی اور شہرت بھی حاصل ہوئی، ان سے شعراء نے بغرضِ اصلاح رجوع کیا" جن میں نواب حشمت جنگ اور سید ابوالحسن حیرت نمایاں ہیں"۔ (قومی زبان ص ۱۶، یکم فروری ۱۹۶۳ء)

قدرت اللہ قاسم کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت کی ملاقات ایک انگریز کٹ صاحب سے ہوئی اور وہ اس کی وساطت سے مدراس میں میر منشی کی خدمت پر مامور ہوئے، سعادت خاں ناصر نگینوی نے بھی لکھا ہے کہ وہ میر منشی بناکر مدراس بھیجے گئے تھے، خزینۃ الامثال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ہمیشہ بعہدہ میر منشی ریاست مدراس سرفراز رہے اور ایسے کام ان سے نمایاں ظاہر ہوئے کہ آج تک اولاد ان کی اس سرکار سے تنخواہ پاتی ہے" (ص ۲) صنم کدۂ چین سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مدراس میں سکونت اختیار کرلی تھی (ص ۳۲)، محسن علی نے لکھا ہے کہ وہ "چیناپٹن مدراس میں ہمراہ کٹ صاحب بہادر کے میر منشی ہوکر گئے تھے، وہیں وفات پائی"۔ ان کی خاندانی دستاویزات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرنل کڈ (Col Kydd) کے ہمراہ میر منشی کی حیثیت سے چیناپٹن مدراس گئے تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا (صحیفہ لاہور ص ۲۵ جنوری ۱۹۶۸ء) مختصر یہ کہ وہ اپنی عمر کے آخری زمانے میں (۱۸۱۰ء کے بعد) میر منشی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ ان کی خدمات کو سراہا گیا اور ان کے مرنے کے بعد بھی ان کی

پنشن وارثین کے حق میں بحال رہی۔

مثنوی ہیرا من طوطا سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت مدراس سے لکھنؤ آئے تھے ؎

دیکھا پھر آ کے لکھنؤ جس آن
کہتے ہیں ہند کی جسے سب جان

مگر مایوس ہو کر پھر لوٹ گئے۔ انھیں لکھنؤ کے حالات پسند نہیں آئے ؎

طرفہ آیا مجھے وہ ملک نظر
خوبی اس کی نگفتہ ہے بہتر

محسن علی کے بیان کے مطابق نیز ان کی خاندانی دستاویزات کے بموجب ان کا انتقال مدراس میں ہوا۔ سید علی حسن خاں نے لکھا ہے کہ وہ مدراس میں فوت اور وہیں کی خاک میں آسودۂ خواب ہوئے (بزم سخن ص ۴۲)

ان کے سنہ وفات میں اختلاف ہے۔ شیفتہ نے لکھا ہے ۱۲۶۰ھ میں فوت ہوئے، صنم کدۂ چین میں مرقوم ہے ۱۲۴۹ھ میں وفات پائی (ص ۳۲) صاحب خوش معرکۂ زیبا نے سنہ وفات ۱۲۴۹ھ قرار دیا ہے (صحیفہ لاہور ص ۲۶ ۔ جنوری ۱۹۶۸ء)۔ ہمارے خیال میں ان کی وفات ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳-۱۸۳۴ء میں ہوئی، کیونکہ مطبع محمدی (جس میں صنم کدۂ چین چھپی تھی) کا حقیقت سے بوجہ ہم وطنی شیفتہ کے مقابلہ میں زیادہ قریب کا تعلق ہے، لہذا اس کی مطبوعہ کتاب کا بیان زیادہ معتبر ہے۔ سعادت خان ناصر مولفہ تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کی شہادت سے مزید تصدیق ہو جاتی ہے کہ وہ ۱۲۴۹ھ میں فوت ہوئے۔

اب حقیقت کے حالات زندگی اس طرح مرتب ہوتے ہیں:-

نام میر حسین شاہ تخلص حقیقت تھا، سید عرب شاہ کے منجھلے فرزند تھے، حضرت سید عبد اللہ ملقب بہ مظلوم کی اولاد میں تھے، جن کا سلسلۂ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام تک پہنچتا تھا، حضرت سید عبد اللہ خلفائے بنو عباس کے جور سے پریشان ہو کر حدود مین میں مخفی طور پر سکونت پذیر ہو گئے تھے، ان کی اولاد سے حضرت امیر کلالؒ مشہور امام ہوئے اور انھوں نے امیر تیمور کو پسر خواندہ فرمایا، ان کے پوتے سید امیر شاہ ترکستان سے اپنی جاگیر، عطیۂ صاحب قران امیر تیمور، شہر نعمت آباد حدود خوست منمضافات بدخشاں میں مقیم ہوئے، اور حسب رواج خاندان ارشاد خلائق میں مصروف رہے۔ تاآنکہ نوبت سجادگی سید میرک شاہؒ کو پہنچی اور وہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں بعہد فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) براہ کابل وارد لاہور ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملۂ ہندوستان (۱۷۶۱ء) کے بعد ان کے پسر سید عرب شاہ، سکھوں کی زبردستیوں سے تنگ آ کر آنولہ (بریلی) تشریف لائے اور وہیں حکیم میر محمد نواز کی لڑکی سے عقد کیا، ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء میں حقیقت پیدا ہوئے، عرب شاہ کا ۱۱۹۴ھ مطابق ۱۷۸۰ء میں انتقال ہو گیا، اور حقیقت اپنے نانا کے زیر تربیت آ گئے، انھوں نے جو کچھ لکھا پڑھا وہ ان کے نانا کی شفقت کا نتیجہ تھا، حکیم میر محمد نواز ۱۷۸۰ء میں یا اس کے چند سال بعد کانپور پہنچے اور عہدۂ منشی گری پر فائز ہوئے، انھوں نے اپنے متعلقین کو بھی کانپور بلا لیا۔ ۱۷۸۵ء میں حقیقت کانپور میں تھے، وہاں سے

چودہ پندرہ برس کی عمر میں لکھنؤ گئے اور جرأت کے ادبی حلقے میں داخل ہوئے، ابتدا میں اپنے استاد کی غزلوں کی کتابت کرتے تھے، اس کے بعد ترک سواروں میں ملازم ہوئے، معلمی کا پیشہ بھی اختیار کیا اور سبزی منڈی لکھنؤ میں بھی کسی خدمت پر مامور رہے، امام بخش خاں کشمیری کے بھی منشی رہے بعد کو ریذیڈنٹ کلکتہ کے دفتر میں اول منشی رہے۔ ۱۸۱۰ء میں نواب کرناٹک کی سرکار سے وابستہ ہوئے، زمانہ آخر میں قسمت نے یاوری کی اور وہ کرنل کڈ کی وساطت سے میر منشی کے عہدہ پر فائز ہو کر چینا پٹن مدراس گئے، جہاں انھوں نے سکونت اختیار کرلی، حسن خدمت کے صلہ میں ان کی اولاد کو پنشن جاری رہی۔ وہ ایک مرتبہ آخری بار لکھنؤ آئے، مگر انھیں لکھنؤ پسند نہ آیا، اس لیے پھر مدراس واپس چلے گئے۔ ۱۲۴۹ھ مطابق ۱۸۳۳ء ۱۸۳۴ء میں مدراس میں وفات پائی اور وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے۔

تصانیف "تصنیف ان کی آٹھ کتابیں ہیں" (خزینۃ الامثال ص۲)

مجھے حقیقت کی آٹھوں کتابوں کا علم ہوا۔ ان کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

(۱) صنم کدۂ چین (۲) جذب عشق (۳) تحفۃ العجم (۴) خزینۃ الامثال (۵) تذکرۂ احباب (۶) مثنوی ہشت گلزار (۷) مثنوی ہیرا من طوطا (۸) ہفت نسخہ۔

صنم کدۂ چین۔ سنہ تصنیف: "یک ہزار و دو صد و نہ ہجری (۱۲۰۹ھ) مطابق ۱۷۹۴ء، ۱۷۹۵ء۔

سنہ طباعت: ۶ر صفر ۱۲۶۳ھ مطابق ۲۴ر جنوری ۱۸۴۷ء۔ مادۂ تاریخ

طباعت "صنم خانہ"۔

نام مطبع:۔ مطبع محمدی لکھنؤ۔ زبان فارسی۔ تعداد صفحات ۳۲۔

تمہید کتاب:۔

"سید حسین شاہ حقیقت غفر اللہ تعالیٰ ذنوبہ و سر عیوبہ کہ بمصداق ایں شعر شعری مرتبت استادی خلاق معانی مجموعۂ فنون سخندانی شہنشاہ اقلیم شہرت حضرت یحیی امان جرأت ادام اللہ تعالیٰ برکاتہ کہ شعر ؎

کچھ داغ جوانی میں نہیں عشق کا چمکا
طفلی میں بھی ہم کھیل جو کھیلے تو صنم کا

از بدو ازل داغی بدل و سوزی در آب و گل داشتم بنا بر علیہ از مدتی ارادہ فراہم آوردن رسالہ قواعد بازی صنم کہ مروج ایں زمانہ واز اختراعات استادان عاشق مزاجست بدل داشتم تا یاران موافق و دوستان صادق نیز باشاہدان پری تمثال بوسیلۂ ایں بازی اشتغال داشتہ حظی کافی بردارند درصورت احتظاظ ایں عاصی پُرمعاصی را بدعاے خیر یاد آرند۔ الغرض این شاہد حجلہ نشین جلباب خفا از حوادث زمانہ شورش افزا بعرصۂ ظہور جلوہ فرما و نقش آرا نمیشد تا درسنہ یکہزار و دو صد و نہ ہجری قدسی بخوہر خواہش دوستان یکرو و یکدل خاصہ نظارہ فرمای جمال بتان سرکوب تماشائیان پری طلعتان دوست خفی و جلی برگزیدہ درگاہ ازلی شیخ محمد علی و خلاصہ دودمان مصطفوی و نقادہ خاندان مرتضوی

باعث آرامش دوستان کالعین سید عنایت حسین سلمہ اللہ تعالیٰ

یک قلم ویک دست صرف اوقات نمود و بہ ترتیب حروف تہجی

بہ تسوید ایں اوراق پرداخت وصنم کدۂ چین موسوم ساخت۔"

مندرجۂ ذیل سطور کتاب کے باب الالف سے لی گئی ہیں۔ عبارت میں علاماتِ وقف واستفہام کا اضافہ میں نے کیا ہے تاکہ اس کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

صنم آمد از کجا ؟ از آذربائیجان ۔ کجا می رود ؟ بہ اصفہان ۔ بر چہ سوارست ؟ اسپ ۔ اسپ چہ پوشیدہ است ؟ اچکن اطلس ۔ در دست چہ دارد ؟ انگشتری ۔ چہ می خورد ؟ آش انگور اندرسی ۔ چہ می نوشد ؟ آب ۔ چہ می سراید ؟ اوج الیمن ۔ کدام شعر یاد دارد ؟ بلے ۔ عربی سعدی

اَن لَم اَمُت یُومَ الوَدَاعَ تاسّفاً

لاتحسبوانی المودّة مُنصِفاً

فارسی ۔ او سخن از کشتن من میکند : من ہمیں خوش کہ سخن میکند

ریختہ رقت

اس طرف وہ ہاتھ سے دامن چھوڑا جانے لگا

اس طرف چاک گریباں پاؤں پھیلانے لگا

دوہرہ

انگ انگ پرت بنیہ پر درپن سے سب کات

دوہری تیہری چوہری بھوکن جانی جات

کبت :۔

آوت ہو پھر موں رہی نیت ایسے کھپائیں ناوک سیں : نہیں ناوتر دیسکی جیتک جبتک پو چھت ہی لوگ لگائیں
میں کہیو کہو کچھو بول جیہ کی پاوں پری اورسومنہ ددائیں : ٹوٹ پری درگ تیں آنسو انکی کھولت ہی نچوڑ کی تائیں

کدام مثل ہم یاد دارد ؟ آری ۔ عربی اذا جاأ القضاء عمی البصر ۔ پارسی آمدن بارادت رفتن باجازت ۔ ہندی ۔ ایں نین کا یہی لیکھ :. وہ بھی دیکھا یہی دیکھ ۔

کدام چیستاں ہم میداند ؟ بلے ۔ لغز

آں چیست کز وحسن بت افزوں گردد ۔ اندر کف مہوشاں موزوں گردد

:. سبز ست منش گر نرسد آب باو چوں آب باو رسید ہمہ خوں گردد

پہیلی لمولفہ

اٹھے تو اک روگ اٹھاوے بیٹھے تو دکھ دے ۔ جاوے تو اندھیری لاوے آوے تو سکھ لے

اس طرح ہر اسم ، شعر ، ریختہ ، دوہا ، کبت ، مثل ، چیستاں اور پہیلی کا پہلا حرف الف سے شروع ہوتا ہے ، یہ التزام پوری کتاب (ص؟) میں حروف تہجی کے اعتبار سے ہے۔ یہ کام بڑی دیدہ ریزی کا تھا ، جس کے لیے کئی زبانوں سے واقفیت ضروری تھی۔ حقیقت اس سے خوبی کے ساتھ عہدہ برآئے۔

(باقی)

شعر الہند حصۂ اول

اس میں قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کیگئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے۔

ضخامت ۴۹۲ صفحے قیمت عہ

منیجر

عربی کے ہندوستانی شعراء پر ایک نظر

از جناب ڈاکٹر حامد علی خاں صاحب

پہلی صدی ہجری ہی میں ہندوستان میں عربی زبان کا داخلہ ہوا، ایک طرف سواحل ہند پر مسلمانوں کی تبلیغی مساعی اور عرب و ہند کی باہمی تجارت نے عربی زبان کے لیے راہ ہموار کی، دوسری طرف نوائط اور کوکن وغیرہ عرب خاندانوں کا ہجرت کرکے گجرات اور مالابار وغیرہ مقامات میں مستقل آباد ہونا عربی زبان کی اشاعت کا سبب بنا، پھر ۹۳ھ میں سندھ مسلمانوں کی فتح کے بعد اسلامی سلطنت کا صوبہ اور عربی زبان کے فروغ کا ذریعہ بنا چنانچہ ہندوستان میں دوسری صدی ہجری ہی سے عربی زبان میں تعلیم و تعلم کا ثبوت ملتا ہے، اس کے بعد سے عربی زبان و ادب کی ترقی برابر جاری رہی، اور نثر کے ساتھ نظم میں بھی بہت کچھ لکھا گیا، تاریخ کے فطری عوامل و نتائج کے ماتحت ہندوستان کی عربی شاعری مختلف اثرات سے متاثر ہوئی۔ زیر نظر مضمون میں چند بنیادی حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ ان اثرات کی نوعیت کا صحیح اندازہ ہو سکے:-

(۱) ہندی نژاد عربی شعراء پہلے عالم تھے، بعد میں شاعر۔

(۲) اسلام نے علم دین کا حاصل کرنا فرض کفایہ قرار دیا ہے، اس لیے عربی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد دینی علوم کی تحصیل تھی اور لسانیات کی طرف توجہ ثانوی ہوا کرتی تھی،

(۳) ملک کی دفتری اور سرکاری زبان فارسی ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے

علماء کو عربی علوم و فنون حاصل کرنے سے پہلے فارسی میں استعداد بہم پہنچانا ضروری ہوتا تھا، عرب کے علاوہ دیگر مسلم ممالک سے ہجرت کرکے ہندوستان میں اقامت گزیں ہونے والے عربی شعراء میں سے اکثر کی مادری زبان فارسی تھی،

(۴) ہندوستان اتنا وسیع ملک ہے کہ اسے برصغیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اس لیے یہاں کے مختلف علاقوں میں مختلف علاقائی زبانیں رائج تھیں، ہندوستانی باشندے اپنی علاقائی مادری زبان سنتے بولتے اور اسی زبان کے ماحول میں تربیت پاتے تھے،

ہندوستان کے عربی شعراء کی شاعری میں لسانی و ادبی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستانی شعراء کو چار طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ان میں سے ہر ایک پر آئندہ سطور میں تبصرہ کیا جائے گا:-

اول۔ اموی اور عباسی عہد میں سندھ کے شعراء۔

دوم۔ سندھ میں عربی حکومت کے زوال کے بعد سے دسویں صدی ہجری تک کے شعراء۔

سوم۔ گیارہویں صدی ہجری سے آج تک کے متوفی شعراء۔

چہارم۔ موجودہ دور کے شعراء، ان کے متعلق قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔

طبقہ اول سندھی شعراء کی تربیت عربوں میں ہوئی تھی، اور زندگی کے ہر پہلو میں ان کا فکر و عمل عربی مذاق کے مطابق تھا، اس لیے ان کی خصوصیات کلام اور ان کے ہم عصر شعرائے مولدین کی خصوصیات بالکل یکساں ہیں، سندھی شعراء کے کلام میں عربوں ہی کی طرح تنوع پایا جاتا ہے، مگر افسوس یہ ہے کہ اس طبقہ کے شعراء کے کلام کا بڑا حصہ دست برد زمانہ سے ضائع ہو گیا، جو مختصر کلام دستیاب ہوتا ہے اس کو دیکھ کر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس طبقے کے سندھی شعراء اپنے معاصر عرب شعراء سے کسی طرح کم نہ تھے، اسکی تصدیق حسب ذیل بیانات سے ہوتی ہے:

میری نظر میں ہندوستان کا سب سے پہلا بلند پایہ عربی شاعر ہارون بن موسیٰ ملتانی ہے، مشہور عرب شاعر کمیت سے اس کے دوستانہ روابط اس کے بلند مرتبہ ہونے پر شاہد ہیں، جاحظ نے بھی اس کو ملتان اور اس کے گرد و نواح کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا ہے، اس کے صرف [illegible] اور ہاتھی کے وصف سے متعلق چھتیس[36] اشعار جاحظ نے کتاب الحیوان میں نقل کئے ہیں جو اوپر نقل کیے جا چکے ہیں، ان کے علاوہ اس کے کلام کا اور کوئی نمونہ محفوظ نہیں رہا، اگر اس کا کلام ضائع نہ ہوگیا ہوتا تو اس دور کے ہندوستان کے متعلق نہایت مفید علمی، تہذیبی، تمدنی اور سماجی معلومات حاصل ہوتے۔

ابو عطاء السندی کے اگرچہ صرف ایک سو چونتیس[134] اشعار دستیاب ہوئے ہیں لیکن یہ اشعار مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں اور ان سے اس کی ادبی صلاحیتوں، کلام کے تنوع، شعر و سخن کی مقبولیت، عوام و خواص کے میلان کا پتہ چلتا ہے، اور یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ابو عطا شعر و ادب میں بلند پایہ کا مالک تھا، اس نے اپنی خداداد ذہانت اور کلام کی بلندی کی بدولت اپنی غلامی کی زنجیروں کو کاٹ کر آزادی حاصل کی اور ایسی شہرت پائی کہ اموی دربار سے وابستہ ہوگیا، اموی حکومت کے خاتمہ کے بعد خلیفہ منصور نے خاندان بنی امیہ کا درباری شاعر ہونے کی بنا پر اظہار بیزاری کیا، ابو عطاء نے اس سے انتہائی دلیری کے ساتھ سر دربار گفتگو اور علی الاعلان عباسی خاندان کی ہجو کی، حماد الراویہ جیسے بے مثل شاعر و ادیب سے اس کی دوستی تھی، مشہور شاعر ابو دلامہ سے معاصرانہ چشمکیں رہیں، اس کی قادر الکلامی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس کے اشعار کو ابو تمام نے حماسہ و مراثی میں جگہ دی ہے،

ابو الضلع السندی کے اشعار کو اس کے عہد کے ممتاز افراد دعبل، ابو ہفان اور

عبد الصمد ابن موسیٰ کا روایت کرنا اس کے بلند پایہ شاعر ہونے کی واضح دلیل ہے، ابن الجراح نے کتاب الورقہ میں اڑسٹھ[68] ممتاز شعراء کا ذکر کیا ہے ان میں ابو الضلع بھی ہے، اور اس کے پانچ قصیدوں کے دس شعر نمونۃً درج کیے ہیں، اسی طرح ابراہیم ابن السندی ابن شاہک کے شعری و ادبی کمالات کا جاحظ جیسے ادیب نے اعتراف کیا ہے اور اس کی مدح کی ہے جو ابراہیم کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے، ابو حا ادیب دیلی کے اشعار بھی اپنے عہد کی عربی شاعری کا اچھا نمونہ ہیں،

ابو الفتح محمود بن حسین بن شاہک بھی ہندی الاصل شاعر ہے، جو کشاجم اور ریحانۃ الادب کے القاب سے یاد کیا جاتا تھا، اول الذکر لقب میں اس کے پانچ اسم اوصاف "کاتب، شاعر، ادیب، جواد اور منجم" کو اختصار کے ساتھ سمویا گیا ہے، کشاجم کی نظر میں ادب اور زندگی میں گہرا تعلق ہے، اس لیے اسکو نیچرل شاعری سے شغف تھا، وہ فی البدیہ اشعار کہتا تھا، اس کا کلام دیوان کشاجم کے نام سے بیروت سے طبع ہو چکا ہے، مگر وہ ناقص ہے، کتب ادب میں کشاجم کے بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جو اس دیوان میں موجود نہیں ہیں، اس کے دیوان کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قادر الکلام شاعر تھا، اور مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتا تھا،

طبقۂ دوم | اس طبقے کے شعراء ہندوستان میں پیدا ہوئے، اور یہیں انکی نشو و نما ہوئی، انھیں عربوں کی صحبت میسر نہیں ہوئی، اس طبقے کے بیشتر شعراء کے کلام کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے، دستیاب شدہ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں شاعری کی صلاحیت فطری تھی اور وہ ہر صنف شاعری میں بے تکلف اشعار کہتے تھے،

اس طبقے کے شعرا کا کلام اپنے معاصر عرب شعرا کے کلام کا ہم پلہ نہیں ہو

زبان کی کتابی استعداد سے اس زبان کا ملکہ حاصل نہیں ہوتا اور نہ زبان کے محاورات و رموز سے پوری واقفیت نہیں ہوتی، اس لیے خواہ وہ کتنے ہی صاحب فضل و کمال ہوں، ان سے اغلاط کا سرزد ہو جانا بعید نہیں، ان شعرا نے عربی نمونوں کو پیش نظر رکھا اور ان کی تقلید کی کوشش کی پھر بھی اصل و نقل کا فرق صاف نظر آتا ہے۔

ان میں ایسے شعرا بھی تھے جن کا علم و فضل میں بھی بڑا پایہ تھا، چند نامور فضلا کے نام یہ ہیں:
عطا و ابن یعقوب غزنوی، یاقوت رومی اور عوفی نے اس کے اشعار نقل کیے ہیں، یہ اشعار نعتِ رسول، مدح سلاطین و امرا، حکم و امثال، پند و نصائح اور رنج و الم وغیرہ پر مشتمل اور اس کی قادر الکلامی، جزالت و سلاست، دل آویز الفاظ و تراکیب اور حسنِ معنی پر شاہد ہیں، مسعود سعد سلمان لاہوری کے صنائع پر مشتمل اشعار ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں، جو اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں، عربی میں اس کا ایک مستقل دیوان تھا، مگر اب وہ ناپید ہے، حسن صاغانی کا نام محتاجِ تعارف نہیں، وہ دینی علوم میں انتہائی فضل و کمال کے ساتھ ادب عربی میں بھی بے نظیر تھے، ایک طرف حدیث میں ان کی مشہور کتاب "مشارق الانوار" پوری اسلامی دنیا میں مقبول ہوئی اور اس کے بہت سے شروح اور حواشی لکھے گئے، عربی درس میں اس کو جگہ دی گئی، دوسری طرف لغت عربی کی تحقیق میں "العباب الذاخر" لکھی، مختلف ماخذوں سے صاغانی کے ایک سو سینتیس اشعار اور ایک مکمل قصیدہ دستیاب ہوا ہے، اس میں شاعرانہ انداز میں آپ بیتی لکھی ہے، ہندستان میں عربی کا یہ پہلا منفرد قصیدہ ہے جس میں لغتِ عربی کے لفظی و معنوی صنائع و بدائع کو برتا گیا، اور پورا قصیدہ صنعت تجنیس میں لکھا گیا ہے،

امیر خسرو کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ ایجاد صنائع، اختراعِ معانی اور رموز غزل

کے اکتشاف میں بے نظیر تھے، عام طور سے شعرا ایک فن یا دو فنوں میں یگانہ ہوتے ہیں، مگر امیر خسرو تمام فنون شعری میں بے مثال تھے، اور انھیں ہندوستان کا "ملک الشعرا" کہا جانا بالکل بجا ہے، اپنی متنوع صلاحیتوں کے باعث ہندستان کے سات بادشاہوں کے مقرب دربار رہے، فارسی کے مقابلہ میں ان کا عربی کلام بہت کم ہے، مگر عربی شعر کہنے پر ان کو پوری قدرت حاصل تھی، "رسائل اعجاز خسروی" میں ان کے متفرق اشعار کی تعداد چھ سو سڑسٹھ ہے، انھوں نے عربی قصیدے بھی لکھے،

قاضی عبد المقتدر شریحی دہلوی عربی زبان کے بڑے فصیح و بلیغ شاعر و ادیب تھے، ان کا تقریباً سارا کلام حوادثِ روزگار کی نذر ہو گیا، طغرائی کے "لامیۃ العجم" کے مقابلے میں "لامیہ" بھی لکھا جو "لامیۃ الہند" کے نام سے مشہور ہوا، یہ نعتیہ قصیدہ سلاست الفاظ اور شیرینی کلام کے باعث ہندستان کے شعرا، و ادبا میں مشہور ہے، اس کے کئی حواشی بھی لکھے گئے، شیخ احمد تھانیسری کی شاعری فطری تھی، انھوں نے عربی میں طویل قصائد لکھے، نعتیہ کلام خاص طور پر قابلِ تعریف ہے، افسوس یہ ہے کہ ان کا صرف ایک ناقص دالیہ نعتیہ قصیدہ دستیاب ہوتا ہے، جو سادگی اور خیالات کی شگفتگی کا نمونہ ہے اور فرسودہ تشبیہوں سے احتراز کیا گیا ہے، زین الدین مالاباری نے متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں، وہ سلاطین و امرا سے نثر و نظم میں مراسلت کرتے تھے، انھوں نے "تحریض اہل الایمان علی جہاد عبدۃ الصلبان" کے عنوان سے ایک قصیدہ لکھا، جس میں پرتگالیوں کے مالابار میں داخلہ اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کرنے کا بیان اور آخر میں جہاد کی ترغیب ہے، تصوف میں ایک قصیدہ "ہدایۃ الاذکیا الی طریق الاولیا" لکھا، جو کتاب البرکہ للوصالی سے ماخوذ ہے، اور ایک سو اسی اشعار پر مشتمل ہے، شیخ عبد القادر حضرمی نے مفتی قطب الدین نہروالی کے بہت سے اشعار نقل

کیے ہیں، اور ان کی پُرگوئی اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے، نہروالی نے عربوں کو "صنعت تعمیہ" سے روشناس کرایا، شاہ احمد شرعی چندیری نے علامہ زمخشری کے قصیدے کے جواب میں ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے صرف دو شعر ہی ملتے ہیں، فضیل ابن جلال کالپوی نے معین الدین طنطرانی کے مقابلے میں قصیدہ لکھ کر ادب عربی میں اپنے کمال کا ثبوت دیا، محمد ابن عبدالعزیز کالی کٹی نے پانچ سو اشعار کا طویل ارجوزہ لکھکر ایک مخصوص صنفِ سخن میں اپنی قادر الکلامی کا نمونہ پیش کیا،

طبقہ سوم یہ طبقہ[1] بھی دوسرے طبقے کی طرح خالص ہندوستانی ہے، ہندستان میں ولادت، تربیت و تعلیم، عرب ماحول سے بیگانگی اور عربی علوم و فنون کی تعلیم سے پہلے فارسی زبان کی تحصیل میں یہ طبقہ اپنے پیشرو طبقے کا سہیم و شریک ہے، اس لیے اس طبقے کے شعراء کی زبان تو عربی ہی رہی لیکن اسلوب و تعبیر میں عجمیت زیادہ پیدا ہوگئی اور زبان کی غلطیوں نے بھی راہ پائی، یہ شعراء "سبع معلقات، دیوان الحماسہ، دیوان المتنبی، دیوان حسانؓ، لامیۃ العجم" وغیرہ کا نمونہ سامنے رکھتے تھے، اس لیے ابتدا سے انتہا تک ان کے کلام میں غیر دلچسپ یکسانیت پائی جاتی ہے، اور تقلید محض نے ان کی شاعری میں ایک قسم کا تکلف و تصنع پیدا کر دیا ہے، بایں ہمہ عربی شاعری میں ان کا ایک مرتبہ ہے، اگرچہ انکا اسلوب عرب شعراء کے اسلوب سے مختلف ہے، اور اس میں عیوب اور اغلاط بھی پائے جاتے ہیں، مگر اس قسم کے عیوب و اغلاط اس زمانہ میں عام ہو گئے تھے، اور عباسی حکومت کے زوال اور طوائف الملوکی کے بعد عربی کی زبوں حالی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ تیرہویں صدی ہجری تک کے تذکروں میں زیادہ تر

[1] اس طبقے کے شعراء میں اکثر کا کلام محفوظ نہیں رہا، تاہم ضا دیوان شعرا کے دواوین کے مخطوطہ یا مطبوعہ نسخے ہندوستان کی مختلف لائبریریوں میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔

محدثین، قضاۃ اور علماء و فضلا کے سوانح ملتے ہیں، مگر عربی کے ادیبوں اور شاعروں کے نام خال خال ہی نظر آتے ہیں، اور ان شعراء کا شعر و ادب میں مرتبہ مولدین سے کہیں فروتر ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب اقتدار کے خاتمے کے بعد عربی کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی، اور عجمیت نے ایسا رسوخ پیدا کر لیا تھا کہ عربی زبان روز بروز انحطاط پذیر ہوتی گئی، جو قوموں کے عروج و زوال کا لازمی نتیجہ ہے، قوموں کے عروج کے ساتھ ان کی زبان کی ترقی اور زوال کے ساتھ زبان کا زوال لازمی ہے، اس لیے اس عہد کے عربی کے ہندوستانی شعراء کے کلام کا عربوں کے مقابلہ میں کم مایہ ہونا تعجب کی بات نہیں۔

اس طبقے کے شعراء کا کلام اس کے پیشرو طبقوں کے مقابلہ میں زیادہ دستیاب ہوتا ہے، اس لیے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس میں تنوع اور اصناف سخن کی کثرت ہے، اور مقامی اثرات سے کچھ جدید اقسام مثلاً سہرا وغیرہ پیدا ہوئے، مگر ان شعراء میں بعض ایسی ممتاز ہستیاں بھی ہیں، جنھوں نے عربوں سے بھی خراج تحسین حاصل کیا، مثلاً شاہ ولی اللہ، آزاد بلگرامی، باقر آگاہ، فضل حق خیرآبادی، مفتی محمد عباس، عبدالجبار خاں آصفی، مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا سید ناصر حسین لکھنوی وغیرہ۔

موجودہ دور میں عربی زبان و ادب کا ذوق بڑھ رہا ہے، اسکے حسب ذیل اسباب ہیں :-

(۱) اس دور میں ہندوستان اور عرب ممالک کے درمیان رسل و رسائل کی سہولتوں میں اضافہ ہو گیا ہے اور ان سے علمی روابط بڑھ گئے ہیں، ان کے نظریات و افکار سے واقفیت، ان سے تعلقات اور اسلامی رشتۂ اخوت کو مستحکم کرنے کے شوق نے ثقافتی تعلقات کو استوار کیا، مصر و عراق سے بکثرت اخبارات اور عربی ماہنامے آنا شروع ہوئے، ان کے ذریعہ ادب عربی سے قریب ہونے میں مدد لی، نئے موضوعات پر

اہل عرب کا کلام سامنے آیا اس کو دیکھکر یہاں کے بھی بعض عربی شاعروں نے جدت سے کام لیا،

(۲) ہندستان سے "النفع العظیم لاہل ہذا الاقلیم"، "شفاء الصدور، البیان، الضیاء، الجامعہ، الرضوان" وغیرہ عربی کے ماہنامے وقتاً فوقتاً جاری ہوئے[1]، آجکل بھی الرائد پندرہ روزہ اور البعث الاسلامی، ماہنامہ دار العلوم ندوۃ العلماء سے نکلتے ہیں، دار العلوم دیوبند سے بھی دعوۃ الحق سہ ماہی رسالہ نکل رہا ہے، خود حکومت ہند کی سرپرستی میں ایک چار ماہی رسالہ "ثقافۃ الہند" نکلتا ہے، یہ رسائل عرب ممالک میں بھی جاتے ہیں، اس لیے عربوں کے رنگ میں عربی لکھنے کی امکانی کوشش کرتے ہیں، اس طرح ان جرائد نے عربیت کے ذوق کو نکھارا۔

(۳) عربی زبان و ادب کی ادبی مجالس کا قیام عمل میں آیا، لکھنؤ میں بہجۃ الادب قائم ہوئی جسمیں عربی کے اصحاب ذوق اپنے مقالات اور کلام پیش کرتے تھے، دار العلوم دیوبند میں "نادیۃ الادب" اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں "نادیۃ العربی" قائم ہے جن میں طلبہ عربی میں تقریر کرتے اور مقالات پڑھتے ہیں، علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں بھی "لجنۃ الادب" کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء نے عربی ادبیات کو ترقی دینے کے لیے اپنا مستقل نصاب تعلیم عام مدارس سے ہٹ کر بنایا، اس کی عربی زبان و ادب کی خدمات کو بیان کرنے کے لیے ایک مستقل اور مبسوط مقالہ کی ضرورت ہے، عربی کی بڑی درسگاہوں میں تقسیم اسناد کے جلسوں اور خاص خاص تقریبوں کے موقعوں پر عربی میں تقریریں ہوتی ہیں اور عربی قصائد پڑھے جاتے ہیں، مگر اس کا کوئی رکارڈ محفوظ نہیں ہے، صرف روداددں میں ان کا ذکر ملتا ہے، ان اسباب نے اس دور میں عربی زبان و ادب کا ذوق دوبارہ زندہ کر دیا ہے،

---

[1] عربی ماہناموں کے علاوہ اردو کے بعض دینی و مذہبی ماہناموں نے بھی عربی سے لگاؤ قائم رکھنے میں مدد کی مثلاً معارف اور برہان وغیرہ میں عربی ادب سے متعلق مختلف موضوعات پر مفید مضامین نکلتے رہتے ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

چار علمی مقالات - از مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی تقطیع بڑی ضخامت ... صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت تحریر نہیں۔ پتہ: شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

یہ "چار مقالہ" فاضل مضمون نگار کے چار علمی مقالات کا مجموعہ ہے، جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں، "الصابئون"، "الامیون"، "آٹھویں صدی کے اندلسی شعراء کا ایک تذکرہ" اور "مالک بن نویرہ کا واقعہ اور حضرت خالدؓ بن ولید"۔ اس بارہ میں علماء و مفسرین میں بڑا اختلاف ہے کہ کلام مجید میں مذکور "الامی و الامیون" اور "الصابئہ اور الصابئون" سے کون لوگ مراد ہیں، ان کی تعیین میں بکثرت اقوال ہیں، "الصابئون" کی تحقیق میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مرحوم کا ایک محققانہ مضمون معارف میں نکل چکا ہے، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی نے بھی اول الذکر دونوں کی تحقیق کی ہے اور ان کے متعلق تمام اقوال و روایات جمع اور ان پر بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ الصابئون سے بگڑے ہوئے دین ابراہیمی کے وہ پیرو مراد ہیں جو موحد اور دین حق کے جویا تھے، اور جن کو حنفا، کہا جاتا تھا، اور "الامیون" سے مراد اَن پڑھ اور نوشت و خواند سے ناآشنا نہیں بلکہ غیر اہل کتاب عرب ہیں، جن کے لیے کوئی آسمانی صحیفہ نازل نہیں ہوا تھا، اور اہل کتاب انکو امی کہتے تھے، تیسرے مضمون میں آٹھویں صدی کے اندلسی شعراء کے ایک تذکرے "الکتیبۃ الکامنۃ" لسان الدین بن الخطیب کا تعارف ہے، چوتھے مقالہ میں اس مشہور روایت کی تحقیق کی گئی ہے کہ فتنۂ ارتداد کے سلسلہ میں حضرت خالدؓ بن ولید نے ایک مرتد مالک بن نویرہ کو جس نے باختلاف روایت

بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا یا ارتداد پر قائم تھا، قتل کرکے اسکی بیوی کے حسن سے مسحور ہوکر میدان جنگ ہی
میں اس سے شادی کرلی تھی۔ فاضل مقالہ نگار نے اس سلسلہ کی تمام غلط اور غیر معتبر روایات کی تنقید
کرکے حضرت خالدؓ پر جو الزام عائد ہوتے ہیں ان کی تردید کی ہے، جو علمی اور دینی حیثیت سے قابل تحسین
ہے، مگر ان کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ اس تحقیق میں وہ منفرد ہیں، اور آج تک مصر و ہندوستان کے
کسی مصنف نے اس پر بحث کرنے کی ہمت نہیں کی (ص ۱۱) اور خلفائے راشدین، سیر الصحابہ
اور تاریخ اسلام کے مصنفین کو اسکے ذکر تک کی جرأت نہیں ہوئی، اور وہ اسے صاف اڑا گئے" (ص ۱۲)
بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ ان کتابوں میں اس پر بحث نہیں کی گئی ہے، مگر ایسا نہیں ہے کہ انکے مصنفین کو اسکی جرأت
ہی نہیں ہوئی اور اس کی تحقیق کا سہرا مقالہ نگار کے سر ہے، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام کے مصنف
نے آج سے ۳۵ سال پہلے اکتوبر ۱۹۳۳ء کے معارف میں ایک انگریز مضمون نگار مسٹر گرہیم لوئیس
کے جواب میں جنھوں نے اس واقعہ کو بڑے آب و رنگ کے ساتھ السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں
لکھا تھا، ایک مفصل مضمون لکھا تھا جس میں مالک بن نویرہ کے واقعہ قتل اور اس کی بیوی سے
حضرت خالدؓ بن ولید کے مفروضہ افسانۂ عشق اور نکاح سے متعلق تمام غیر معتبر روایات کی تنقید،
اصلی واقعہ کی تحقیق اور حضرت خالدؓ پر عائد کردہ الزامات کی پوری تردید کی تھی، اس مضمون کو اس زمانہ
کے بہت سے اخبارات و رسائل نے بھی نقل کیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضمون فاضل مضمون نگار کی نظر سے
نہیں گذرا، ورنہ وہ اولیت کا دعویٰ نہ کرتے، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فاضل مضمون نگار
کے مقالہ میں بعض بحثیں زیادہ ہیں، لیکن یہی معارف کے مضمون کے متعلق بھی کہا جاسکتا ہے، یہ اپنا اپنا
نقطۂ نظر ہے، اس سے اصل بنیادی بحث پر اثر نہیں پڑتا، اس "خوش فہمی" سے قطع نظر یہ مجموعہ علمی و
تحقیقی حیثیت سے قابل قدر ہے۔

تذکرہ شعرائے کشمیر ۔ مؤلفہ محمد اصلح متخلص بہ مرزا، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۶۶ صفحات

کاغذ اعلیٰ، خوبصورت ٹائپ میں چھپی ہے، قیمت تیس روپئے۔ پتہ: اقبال اکیڈمی، ۶/
۴۳ بلاک ۶/۲ پی، ای، سی، ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

پاکستان سے اسلامی علوم و ادبیات پر عربی، فارسی، اردو اور انگریزی میں نہایت مفید اور
اہم کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، ان میں مذکورۂ بالا تذکرہ بھی ہے، اس کے مصنف محمد اصلح المتخلص بہ
مرزا، محمد شاہ کے ہم عصر تھے، یہ تذکرہ نایاب تھا، حسن اتفاق سے پاکستان کے نامور فاضل سید حسام الدین
راشدی کو اسکے دو نسخے مل گئے، ان کی مدد سے انھوں نے بڑی محنت سے یہ نسخہ مرتب کیا ہے،
اس میں ۳۰۵ کشمیری شعرا کا حال اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، جن شعراء کا حال برائے نام تھا،
فاضل مرتب نے ان کے مزید حالات تلاش کرکے حاشیے میں ان کا اضافہ کردیا ہے، کتاب کے
شروع میں ان کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں کشمیر کے شعراء کے حالات میں جو تذکرے
لکھے گئے ہیں یا جن کتابوں میں انکا ذکر ہے، ان کا ذکر اور اس تذکرہ کی ترتیب کی پوری روداد درج ہے،
کتاب تصحیح و تحشیہ، تہذیب و ترتیب، فہرست، مآخذ اور اسماء و اعلام کے انڈکس جملہ لوازم
سے آراستہ ہے، اس سے فارسی کے قدیم تذکروں میں ایک اہم تذکرہ کا اضافہ ہوا،

تذکرہ شعرائے کشمیر جلد اول ۔ مولفہ سید حسام الدین راشدی، تقطیع بڑی، ضخامت
۵۱۶ صفحات، کاغذ عمدہ، ٹائپ خوبصورت، قیمت ۳۰ روپئے، یہ تذکرہ بھی اوپر کے پتہ سے ملے گا۔

مذکورۂ بالا تذکرہ کی تصحیح و ترتیب کے سلسلہ میں فاضل مرتب کو بہت سے تذکروں
اور کتابوں کی ورق گردانی کرنا پڑی تھی، ان میں ان کو کئی سو ایسے شاعروں کا نام ملا جن کا
ذکر اصلح کے تذکرہ میں نہیں تھا، اس لیے انھوں نے تین جلدوں میں اس کا تکملہ مرتب کردیا،
جن کی حیثیت بجائے خود مستقل ہے، زیر نظر حصہ اس کی پہلی جلد ہے، اس میں ایک سو بیس (۱۲۰)
شعراء کا حال اور ان کا نمونۂ کلام ہے، اس کی تالیف میں فاضل مصنف نے جو محنت اٹھائی ہے

اور جس طرح دانہ دانہ چن کر یہ خرمن جمع کیا ہے، اس کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں مؤلف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے جس میں تذکرہ کی ترتیب کے متعلق ضروری باتیں درج ہیں، مگر اس میں فہرستِ مآخذ اور اسماء و اعلام وغیرہ کا انڈکس نہیں ہے، غالباً آخری حصہ میں تمام حصوں کا ایک ساتھ ہوگا، یہ دونوں تذکرے شاہ ایران محمد رضا پہلوی کے جشن تاجپوشی کی یادگار میں شائع ہوئے ہیں۔

مبادیاتِ تحقیق عبدالرزاق صاحب قریشی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۰۶ صفحات کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت چار روپئے ۵۰ پیسے۔ پتہ: ادبی پبلشرز، شیفر روڈ۔ بمبئی ۸

علمی تحقیقات (Resurch) ایک مستقل فن بن گیا ہے، یورپین زبانوں میں اس پر مستقل کتابیں ہیں، اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں تھی، لائق مصنف نے یہ کتاب لکھکر اس کمی کو پورا کیا ہے، وہ خود کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ انجمن اسلام بمبئی میں پی، ایچ، ڈی کے طلبہ کی رہنمائی بھی کرتے ہیں، اس لیے انکو تحقیق کے اصولوں سے بھی پوری واقفیت ہے، اور اس کا ان کو عملی تجربہ بھی ہے، یہ کتاب ان کے علم اور عملی تجربات کا نچوڑ ہے، اس میں انھوں نے تحقیق کے اصول و کلیات سے لے کر اس کے جزئیات اور ماخذوں کی تلاش و تحقیق، ان سے استفادہ کے طریقے سے لے کر مقالہ کی تسوید تک کے لیے مفصل ہدایات اور ضروری معلومات مختلف عنوانات کے ماتحت جمع و مرتب کر دیے ہیں، اس لحاظ سے اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے اور وہ ریسرچ اسکالرس کے لیے بہترین گائڈ کا کام دے سکتی ہے۔

"م"

جلد ۱۰۲ ماہ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۸ء عدد ۲

مضامین